ماہنامہ

حکمۃ قرآن

لاہور

اشاعت خصوصی بموقع

سالانہ محاضرات قرآنی

۲۳ تا ۲۷ مارچ ۱۹۸۵ء

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

1	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	4.00
2	راہِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	5.00
3	قرآن حکیم کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ	10.00
4	مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب	12.00
5	قرآن اور امن عالم	2.00
6	رسول کامل ﷺ	6.00
7	نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت	4.00
8	نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	3.00
9	معراج النبی ﷺ	3.00
10	شہید مظلوم (حضرت عثمان ذو النورینؓ)	4.00
11	سانحہ کربلا (شہادت حسینؓ کا اصل پس منظر)	3.00
12	اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام	2.00
13	اسلام میں عورت کا مقام	10.00
14	عظمت صوم	2.00
15	عید الاضحٰی اور فلسفہ قربانی	3.00
16	اسلام اور پاکستان	5.00
17	علامہ اقبال اور ہم	2.00

تراجم

1	ماذا یجب علی المسلمین تجاہ القرآن	(قرآن مجید کے حقوق کا عربی ترجمہ)	5.00
2	حقوق قرآن بر مسلمان	(" " " فارسی ترجمہ)	
3	The Obligations Muslims owe to the Quran.	(انگریزی ترجمہ)	5.00
4	The way to Salvation in the light of Surah Al-Asr.	("راہِ نجات" " ")	5.00
5	The Quran & World Peace.	("قرآن اور امن عالم" " ")	4.00
6	Islamic Renaissance The Real Task Ahead.	("اسلام کی نشاۃ ثانیہ" " ")	4.00
7	Rise & Decline of Muslim Ummah.	("سرافگندیم" کا ایک باب " ")	5.00

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرۃ ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

جلد ۴	مارچ، اپریل ۱۹۸۵ء مطابق جمادی الاُخریٰ و رجب ۱۴۰۵ھ	شمارہ ۲،۱

سالانہ زرِ تعاون: ۳۰ روپے ✤ اس شمارے کی قیمت - ۱۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

فون ٨٥٣٦١١

فہرس

★ حرفِ اوّل ——— ۳
عاکف سعید

★ سالانہ محاضراتِ قرآنی ——— اور
اس ضمن میں علماء کرام کے نام ڈاکٹر اسرار احمد کا عریضہ ۵

★ مقدمہ ——— ۱۳
مسلمانوں کی دینی ذمہ داریاں قرآن حکیم کی روشنی میں
ڈاکٹر اسرار احمد

★ حقیقتِ انسان (۲) ——— ۲۷
ڈاکٹر اسرار احمد

★ القسم (سورۃ الحجر) ——— ۴۰
ڈاکٹر اسرار احمد

★ قرآنِ کریم کا نظامِ عدل ——— ۴۵
مولانا اخلاق حسین قاسمی

★ تعلیم سے صحیح نتائج کیسے حاصل ہوں؟ ——— ۵۷
چند دردمندانہ تجاویز
مولانا سعید الرحمٰن علوی

★ قرآنی علم و فہم کا درجۂ حکمت (۱۴) ——— ۷۱
مولانا محمد تقی امینی

★ مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت (آخری قسط) ——— ۸۱
مولانا محمد طاسین

★ مزید اشکالات کے جوابات ——— ۹۵
بسلسلہ "مروجہ نظام زمینداری اور اسلام"
مولانا محمد طاسین

★ تبصرہ کتب ——— ۱۱۰
مولانا سعید الرحمٰن علوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

الحمدللہ کہ مارچ اپریل ۸۵ء مطابق جمادی الاُخریٰ رجب ۱۴۰۵ھ کا مشترکہ شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اس شمارے کو 'چھٹے سالانہ محاضراتِ قرآنی' کے موقع پر ایک 'خصوصی اشاعت' کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے ——— پیشِ نظر شمارے کا آغاز والدِ محترم، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تین تحریروں سے ہو رہا ہے ان میں سے پہلی دو کا پس منظر یہ ہے کہ ۸۳ء کے محاضراتِ قرآنی کے لئے انہوں نے 'مسلمانوں کی دینی ذمہ داریاں، قرآن حکیم کی روشنی میں' کے عنوان سے ایک اہم مقالہ سپردِ قلم کرنے کا آغاز کیا تھا لیکن اُس کا صرف مقدمہ ہی تحریر کر سکے تھے جو محاضرات کی ایک نشست میں پڑھ کر سُنایا گیا تھا، بقیہ مضمون تقریر کی شکل میں بیان ہوا تھا۔ اس سال، چونکہ محاضراتِ قرآنی کے لئے اسی موضوع کو ایک عمومی بحث کے لئے اختیار کر لیا گیا ہے لہٰذا والدِ محترم نے اس کے لئے علماءِ کرام کو اظہارِ خیال کی دعوت دینے کی غرض سے پورے مضمون کا ایک خلاصہ (SYNOPSIS) مرتب کر دیا، جو علماءِ کرام کو دعوت نامے کے ساتھ ارسال کیا گیا اور ماہنامہ میثاق (مارچ ۸۵ء) میں شائع بھی کر دیا گیا ——— زیرِ نظر شمارے میں پہلے 'تصورِ فرائضِ دینی' کا ملخص (SYNOPSIS) شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اس کے ابتدائی 'جملوں کی شرح' کی حیثیت سے متذکرۂ بالا 'مقدمہ' شائع کیا جا رہا ہے ——— تیسری تحریر سلسلہ وار مضمون 'حقیقتِ انسان' کی دوسری کڑی ہے جس کا حکمتِ قرآن کے بہت سے قارئین کو شدّت سے انتظار تھا۔

چھٹے سالانہ محاضراتِ قرآنی، ان شاءاللہ العزیز، ۲۳ تا ۲۰ مارچ منعقد ہونگے۔ پاکستان اور بھارت کے قریباً ایک صد علماء کی خدمت میں محاضرات کا دعوت نامہ ارسال کیا گیا ہے، جن علماء کے لئے محاضرات میں شرکت کرنا کسی سبب سے ممکن نہ ہو گا ان سے بھی ہماری گذارش ہے کہ وہ محاضرات کے لئے طے شدہ موضوعات پر تحریری طور

پر مفصل آرا بذریعہ ڈاک ہمیں ضرور بھیج دیں ۔ چنانچہ محاضرات کے ضمن میں جتنے بھی مضامین یا مقالات ہم تک پہنچیں گے انہیں ترتیب وار شائع کر دیا جائے گا ۔ ان شاء اللہ ۔

مولانا محمد طاسین صاحب کے محققانہ مقالے 'مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت' کی آخری قسط اس شمارے میں شامل ہے ۔ مزید برآں 'مزید اشکالات کے جوابات' کے عنوان سے مولانا موصوف کا ایک اور مضمون بھی شامل اشاعت ہے، جس میں مولانا نے محمد اکرم خان، ڈائریکٹر کمرشل آڈٹ کے بعض اعتراضات کا جواب دیا ہے ۔ محمد اکرم خاں صاحب کے اعتراضات کا تعلق مولانا طاسین صاحب کے اُس مفصل اور وقیع مقالے سے ہے جو 'مروجہ نظام زمینداری اور اسلام' کے زیر عنوان متعدد اقساط کی شکل میں 'حکمتِ قرآن' میں سلسلہ وار شائع ہوا تھا، اس سے قبل بھی محمد اکرم خاں صاحب نے کچھ اعتراضات پیش کئے تھے جو دسمبر ۸۳ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے، مولانا طاسین صاحب کی جانب سے اُن اشکالات کا جواب مارچ ۸۴ء کے حکمتِ قرآن میں شائع کیا گیا تھا ۔ بعد ازاں محمد اکرم خاں صاحب کے وارد کردہ 'مزید اشکالات' کو اگست ۸۴ء کے شمارے میں شاملِ اشاعت کیا گیا تھا، مولانا کی جانب سے ان کا جواب اس شمارے میں قارئین کی نظر سے گذرے گا۔

اِن شاءاللہ اِس سال قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں

۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۵ء روزانہ بعد نمازِ مغرب

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے زیرِ اہتمام سالانہ

محاضراتِ قرآنی

کا موضوع :

'قرآن کا تصوّرِ فرائضِ دینی'

ہو گا، جس میں ان شاء اللہ العزیز جملہ مکاتبِ فکر کے جیّد علماءِ کرام حصّہ لیں گے۔

ذیلی عنوانات

عبادتِ ربّ، شہادت علی النّاس، اقامتِ دین

جہاد فی سبیل اللہ، التزامِ جماعت، بیعتِ سمع و طاعت

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!

(نوٹ : خواتین کی شرکت کے لئے پردے کا اہتمام ہو گا!)

عریضہ بنام علماءِ کرام

محترم و مکرم جناب ____________

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ـــــ مزاجِ گرامی!

جناب کے علم میں ہے کہ راقم الحروف اللہ کی کتابِ حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اس کے دینِ متین کا ایک حقیر خادم ہے۔ اُس نے ایک انجمن "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کے نام سے ۱۹۷۲ء میں قائم کی تھی جس کا وہ تاحیات صدر ہے۔ اور ایک دینی جماعت "تنظیم اسلامی" کے نام سے ۱۹۷۵ء میں قائم کی تھی جس کا وہ امیر ہے!

انجمن کے جملہ وابستگان اور تنظیم کے تمام رفقاء کار، ظاہر ہے کہ، راقم ہی کے دروسِ قرآن، اور تحریروں اور تقریروں سے متاثر ہو کر راقم کے معاون و مددگار بنے ہیں ـــ لیکن "الحمد للہ" کہ میرا مزاج ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اپنے رفقاء و معاونین کو صرف اپنے ہی فہم و فکر کے حصار میں محصور نہ رکھوں۔ بلکہ وسیع تر حلقے سے ذہنی و فکری استفادے کی تلقین بھی کروں اور اس کے مواقع بھی پیدا کروں ـــ چنانچہ انجمن کے زیرِ اہتمام جو سالانہ "قرآن کانفرنسوں" اور "محاضراتِ قرآنی" کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا ہے اور اُن میں جملہ مکاتبِ فکر کے علماء کرام اور اصحابِ علم و فضل حصہ لیتے رہے ہیں تو اس سے دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی پیشِ نظر رہا ہے کہ وابستگانِ انجمن اور رفقاءِ تنظیم کا ذہنی افق وسیع ہو اور وہ جس راہ پر چلیں "علیٰ وجہ البصیرت" چلیں!

اس سال "محاضراتِ قرآنی" کے ضمن میں راقم نے طے کیا ہے کہ اصحابِ علم و فضل کو اپنے دینی فکر، بالخصوص "**تصوّرِ فرائضِ دینی**" پر تنقید کی دعوت دے تاکہ اگر انہیں اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو اُس کی نشاندھی فرمائیں، بصورتِ دیگر تائید و تصویب سے نوازیں، ـــ اس مقصد کے لئے راقم نے اپنی دینی سوچ، خصوصاً اپنے تصوّرِ فرائضِ دینی کا ایک "خلاصہ"

مرتب کیا ہے جو جناب کی خدمت میں اس عریضے کے ساتھ ارسال ہے!

جیسے کہ جناب منسلکہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے راقم کا "تصورِ فرائضِ دینی" **چھ عنوانات** کے ذیل میں مندرج ہے: تین اساسی فرائض، اور تین ان کے لوازم، ۔۔۔ ادھر محاضرات بھی ان شاء اللہ **چھ یوم** جاری رہیں گے۔ بنا بریں مناسب تقسیم یہ رہے گی کہ روزانہ ایک ایک عنوان زیرِ بحث آئے، چنانچہ اگر جناب ان میں سے کسی ایک عنوان پر اظہارِ خیال فرمانا چاہیں تو اگر دنوں کی ترتیب کے لحاظ سے پروگرام بنائیں تو انسب ہوگا، اگر بحیثیتِ مجموعی پورے تصورِ فرائض پر گفتگو کرنی مقصود ہو تو وہ کسی بھی دن کی جا سکے گی۔ بہرحال اس ضمن میں کوئی چیز بھی "شرط" کے درجے میں نہیں ہے!

اسی طرح "ان شاء اللہ العزیز" سوائے ایک وقت کی پابندی کے اور کوئی پابندی کسی مقرر پر نہیں ہوگی اور آزادانہ اظہارِ خیال کا پورا موقع ہوگا ۔۔۔ اس ضمن میں اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ ان اجتماعات میں راقم خود بھی سراپا گوش رہے گا اور امکانی حد تک "استفادے" کی کوشش کرے گا اور صورت ہرگز کسی بحث مباحثے کی نہیں بنے گی۔

آخر میں جناب سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لئے ضرور وقت نکالیں۔ اس لئے کہ کسی دینی خدمت و تحریک کی بروقت رہنمائی، خصوصاً جبکہ اُس کا محرک و داعی خود اس کے لئے مستدعی ہو ایک اہم دینی فریضہ ہے! ۔۔۔ بصورتِ دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ پر ایک حجّت قائم ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی جناب ہی نے توجّہ نہ فرمائی، فقط والسلام مع الاکرام۔

رہنمائی کا طالب، خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

لاہور - ۱۲ر فروری ۸۵ء

(نوٹ: یہ عریضہ کم و بیش یک صد علماء کرام کی خدمت میں ارسال کیا گیا)

میرے تصوّرِ فرائضِ دینی کا خلاصہ

★ **تمہید**: انسانی شخصیت کے دو[2] رُخ ہیں: ایک[1] علم دوسرے[2] عمل۔ اسلام میں علمِ صحیح کا مظہرِ اتم 'ایمان' ہے جبکہ عملِ صحیح کی اساس 'تصوّرِ فرائض' پر قائم ہے۔ ایمان، انسان کو علمِ حقیقت ہی عطا نہیں فرماتا صحیح محرّک عمل بھی دیتا ہے، اس اعتبار سے اوّلین اہمیت اسی کی ہے، چنانچہ ایمان کی ماہیت، اس کی تفاصیل، اس کے درجات، اس کے حصُول کے ذرائع اور اس کے لوازم وثمرات اہم ترین موضوعات ہیں لیکن موجودہ محاضرات میں اصل بحث ان پر نہیں بلکہ 'تصوّرِ فرائضِ دینی' پر ہے!

★ راقم کے نزدیک ایک مسلمان کے '**اساسی دینی فرائض**' **تین**[3] **ہیں**:

(۱) ایک یہ کہ وہ خود صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!

★ اس کے لئے چار اساسی اصطلاحات ہیں: اسلام[1]، اطاعتِ[2] خدا و رسُول[ﷺ]، تقویٰ[3] اور **عبادت**[4]۔

★ یہ کیفیات انسان میں ہمہ تن، ہمہ وقت اور بہمہ وجوہ مطلوب ہیں نہ کہ جُزوی یا جزوقتی —— الّا یہ کہ کبھی غفلت کے باعث یا جذبات کی رَو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے مغلوب ہوکر کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے، تو اس پر فوری توبہ اللہ کے یہاں لازماً مقبول ہوگی (النساء: ۱۷) —— اس کے برعکس اگر جان بوجھ کر کوئی ایک 'معصیت' بھی مستقل طور پر اختیار کرلی گئی اور اس پر توبہ کی بروقت توفیق نہ ملی تو اس سے نہ صرف تمام نیکیوں کے ضائع چلے جانے بلکہ جہنم میں داخلے، حتّٰی کہ 'خلود فی النّار' تک کا اندیشہ ہے (البقرہ: ۸۱) الّا یہ کہ حقیقی اور واقعی 'اضطرار' ہو!!

(۲) دوسرے یہ کہ دُوسروں کو حتّی المقدور اسلام کی تبلیغ کرے اور دین کی دعوت دے!

★ اس کے لئے یوں تو بے شمار اصطلاحات ہیں جیسے انذار، تبشیر،

تذکیر، وعظ، نصیحت، وصیت، تعلیم، تبیین، تلقین۔

☆ لیکن اہم تر اصطلاحات چار ہی ہیں: تبلیغ، دعوت، امربالمعروف ونہی عن المنکر اور شہادت علی النّاس ۔

☆ یہ خود انسان کی اپنی شرافت و مروّت کا تقاضا بھی ہے اور ابنائے نوع کی ہمدردی و خیرخواہی کا تقاضا بھی، لیکن سب سے بڑھ کر یہ سیّدالمرسلین **محمدؐ** رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر **ختمِ نبوّت** کا منطقی نتیجہ ہے کہ اب تا قیامِ قیامت تمام انسانوں پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی جانب سے اتمامِ حجت یعنی "شہادت علی النّاس" کی ذمّہ داری بحیثیتِ مجموعی اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کے کندھوں پر ہے!

(۳) تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اس کے دینِ حق کے بالفعل قیام اور غلبے کے لئے تن، من، دھن سے کوشاں ہو۔

★ اس کیلئے قرآن حکیم کی چار اساسی اصطلاحات ہیں: تکبیرِ ربّ، اِقامتِ دین، اظہارِ دینِ الحق علی الدّین کلّہٖ، اور لیکون الدّین کلّہٗ للّٰہ'

★ حدیث نبویؐ میں ایک پانچویں اصطلاح وارد ہوئی ہے: اِتکون کلمۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا — اور

★ تین عام فہم تعبیرات ہیں: قیامِ حکومتِ الٰہیہ، نفاذِ نظامِ اسلامی، اور اسلامی انقلاب!

مذکرہ بالا تین فرائض کی باہمی نسبت اور اُنکے ایمان اور ارکانِ اسلام کے ساتھ ربط و تعلّق ایک ایسی سہ منزلہ عمارت کی مثال سے خوب واضح ہوجاتا ہے جس کی — (i) ایک زیرِ زمین بنیاد ہے جو نظر نہیں آتی لیکن پوری عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کا دارومدار اسی پر ہے۔ (ii) اسی بنیاد کا ایک حصہ زمین سے باہر ہے جو نظر آتا ہے جسے عرفِ عام میں 'کرسی' اور انگریزی میں PLINTH کہتے ہیں۔ (iii) پہلی منزل پر صرف چار ستون ہیں، دیواریں تعمیر نہیں کی گئیں، ظاہر ہے کہ اوپر کی پوری تعمیر کا وزن ان ہی کے ذریعے بنیاد تک پہنچتا ہے (iv) ان ستونوں پر پہلی چھت قائم ہے (v) دوسری چھت بھی اگرچہ ان ستونوں ہی پر قائم

ہے لیکن دیواروں کی تعمیر کے باعث ستون نظر نہیں آتے (۷) اس کے اوپر تیسری اور آخری چھت ہے اور اُس کا بھی معاملہ یہی ہے ——— !

اس مثال میں : (ا) زیرِ زمین بنیاد — ایمان کا "تصدیقٌ بالقلب" والا حصّہ یعنی یقینِ قلبی ہے ! (ب) بنیاد کا نظر آنے والا حصّہ ——— "اقرارٌ باللسان" ——— یعنی کلمۂ شہادت ہے ! (ج) چار ستون چار عبادات کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج - (د) پہلی چھت اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت کی نمائندگی کرتی ہے (ھ) دوسری چھت — تبلیغ، دعوت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور شہادت علی الناس سے عبارت ہے ——— اور (و) تیسری اور آخری چھت تکبیرِ ربّ، اقامتِ دین، اظہارِ دین، اعلاء کلمۃ اللہ یا قیامِ حکومتِ الٰہیّہ کی مظہر ہے ! واللہ اعلم !!

★ اِن تین اساسی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کیلئے تین لوازم لابدّ منہ ہیں :

(ا) دوامِ 'جہاد فی سبیل اللہ' جس کا ظہور :

★ فریضۂ اوّل کے ضمن میں (i) نفسِ امّارہ (ii) شیطانِ لعین اور اُس کی ذریّتِ صلبی ومعنوی اور (iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے غلط رجحانات اور دباؤ ——— کے خلاف جدّوجہد اور زور لگانے کی صورت میں ہوتا ہے اور حدیثِ نبویؐ کی رُو سے یہی 'افضل الجہاد' ہے

★ فریضۂ ثانی کے ضمن میں دعوت وتبلیغ کے لئے جان ومال کھپانے کی صورت میں ہوتا ہے، اور

★ فریضۂ ثالث کے ضمن میں سر دھڑ کی بازی لگانے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل کی قوّتوں سے 'بالفعل' اور 'بالید' پنجہ آزمائی کی صورت میں ہوتا ہے جس کے لئے تن، من، دھن لگا دینے کا عزم، حتّٰی کہ جان دیدینے کی 'آرزو' کا ہونا لازمی ہے !

گویا جہاد کی پہلی منزل مجاہدہ مع النفس اور آخری منزل قتال فی سبیل اللہ ہے !

واضح رہے کہ اِسی کا 'منفی پہلو' ہجرت ہے،

چنانچہ اسکی بھی پہلی منزل "اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ" ہے اور آخری یہ کہ اقامتِ دین کی جدّوجہد میں وقت آنے پر گھر بار، مال و منال اور اہل و عیال کو چھوڑ کر نکل جایا جائے!

جہاد کی پہلی دو منزلوں کے لئے اصل آلہ و ہتھیار قرآن مجید ہے یعنی جہاد بالقرآن

چنانچہ "مجاہدہ مع النفس" کا مؤثر ترین ذریعہ ہے قرآن کے ساتھ قیام اللیل یا تہجّد! اور دعوت و تبلیغ کا پورا عمل بھی قرآن حکیم ہی کی اساس پر اور اسی کے ذریعے ہونا چاہیئے!!۔

تیسری اور آخری منزل پر عہد حاضر میں 'جہاد بالید' کی موزوں ترین صورت فواحش و منکرات کے خلاف پُرامن مظاہرے ہیں، لیکن اس میں نوبت فقہاء کرام کی طے کردہ شرائط کے تحت 'قتال یعنی 'جہاد بالسیف' تک بھی آسکتی ہے۔

(۲) لزومِ اجتماعیت، جس کا تقاضا:

★ فریضۂ اوّل کے ضمن میں صرف صحبتِ صالح (بفحوائے: كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ) سے بھی پورا ہوسکتا ہے!

★ اسی طرح فریضۂ ثانی کے ضمن میں درسگاہوں، اداروں، انجمنوں اور سوسائٹیوں سے پورا ہوسکتا ہے!

★ لیکن فریضۂ ثالث کے ضمن میں "سمع و طاعت فی المعروف" کے ٹھیٹھ اسلامی اور عسکری اصول پر مبنی جماعت کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا (اور یہی مراد ہے آنحضورؐ کے ان الفاظ مبارکہ سے کہ: "وَ آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ"

(احمدؒ و الترمذیؒ عن الحارث الاشعریؓ)

(۳) 'بیعت' ــــ جو: ــــ

★ پہلے دو فرائض کے ضمن میں 'بیعتِ سلوک و ارشاد' کی صورت

بس کفایت کرتی ہے ۔ **لیکن**

★ فریضۂ ثالث کے ضمن میں 'بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف' کی صورت لازمی و لابدی ہے! چنانچہ اس کا لزوم ثابت ہوتا ہے مسلم کی روایت (عن عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما) سے جس میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یہ الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں کہ "مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِیْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً ـــ!" ـــ واضح رہے کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں: (i) اگر کم سے کم شرائط و معیارات پر اترنے والا صحیح اسلامی نظامِ حکومت قائم ہے تو اُس کے سربراہ سے بیعت سمع و طاعت ہوگی ـــ اور (ii) اگر ایسا نہیں ہے تو صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جدّوجہد کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعتِ سمع و طاعت ہوگی ـــ

★ چنانچہ: (۱) 'انجمن خدّامُ القرآن' کا مقصد ہے 'جہاد بالقرآن'، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں اس کے قیام کے وقت اس کے جو 'اغراض و مقاصد' معین ہوئے وہ یہ تھے: (۱) عربی زبان کی تعلیم و ترویج (۲) قرآن مجید کے مطالعہ کی عام ترغیب و تشویق (۳) علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت، (۴) ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت جو تعلیم و تعلّم قرآن کو مقصدِ زندگی بنالیں ـــ اور (۵) ایک ایسی 'قرآن اکیڈمی' کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے، اور

(۲) 'تنظیمِ اسلامی' ہے 'جملہ دینی فرائض' کی انجام دہی کے لئے 'بیعتِ ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ و سمع و طاعت فی المعروف' پر مبنی خالص دینی جماعت!!

میں نے اپنا مافی الضمیر کھول کر بیان کر دیا ہے اب علماءِ کرام اور اصحابِ دانش کا فرض ہے کہ رہنمائی فرمائیں! خاکسار اسرار احمد

مُسلمانوں کی دینی ذمّہ داریاں

قرآنِ حکیم کی روشنی میں

مُقدّمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر باشعور انسان جانتا ہے کہ کسی انسان کے رویّے اور طرزِ عمل کی صحت و درستی کا دارومدار دو چیزوں پر ہے: ایک یہ کہ اُس کے نظریات اور تصوّرات دُرست ہوں یا بالفاظِ دیگر اسے صحیح علم حاصل ہو اور دوسرے یہ کہ وہ ایک صحتمند اور توانا قوّتِ ارادی کا مالک ہو۔ اس لئے کہ مقدّم الذکر سے منزل اور رُخ کا تعیّن ہوتا ہے اور مؤخر الذکر سے پیش قدمی کی شان اور رفتار کا۔ چنانچہ اگر رُخ ہی غلط معین ہو جائے تو رفتار خواہ سُست ہو خواہ تیز نتیجہ بہرصورت وُہی رہے گا کہ ؎

"ترسم کہ بہ کعبہ نہ رسی اے اعرابی کیں راہ کہ تو می روی بہ ترکستان است!!"

بلکہ اس صورت میں انسان کی کمزور قوّتِ ارادی اس کے حق میں مآلِ کار کے اعتبار سے مفید ہی رہے گی کہ غلط راہوں پر اُس کی پیشقدمی سُست رفتاری سے ہو گی۔ گویا معاملہ وہ ہو گا کہ ع "عصمتِ بی بی است از بے چادری" اور اگر معاملہ برعکس ہو یعنی نظریات و تصوّرات تو درست ہوں لیکن قوّتِ ارادی مضمحل ہو تو صورت وہ بنے گی جس کی تصویر کھینچی ہے غالب نے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی!!

یا جس کی نقشہ کشی کی ہے مولانا حسرت موہانی نے کہ ؎

"غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتائیں　　میرے شوق کی بلندی میری ہمتوں کی پستی"

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تصورات و نظریات یا علوم کا تعلق دماغ سے ہے جبکہ جذبہ و ارادہ قلب سے متعلق ہیں چنانچہ اکثر و بیشتر اسی نظریئے کی ترجمانی سمجھی جاتی ہے جبران خلیل جبران کے اس مشہور فقرے میں کہ "عقل سے روشنی حاصل کرو اور جذبہ کے تحت حرکت کرو!" ——— لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے ارادہ تو فی الواقع کلیتہً قلب ہی سے متعلق ہے لیکن علم کا تعلق دل اور دماغ دونوں سے ہے ——— یعنی علم نظری جو زیادہ تر حسیات و مظاہر اور جزئیات و تفاصیل سے متعلق ہے، اُس کا محل تو یقیناً دماغ ہی ہے لیکن علمِ وجدانی جس کا موضوع کلی مابعد الطبعیاتی حقائق ہیں، اُس کا مہبط قلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے تفقہ اور تعقل کو قلب و فواد سے متعلق قرار دیا ہے۔ گویا انسان میں دو عقلیں ہیں: ایک عقلِ حیوانی جو متعلق ہے دماغ سے اور دوسری عقلِ روحانی یا اصل عقلِ انسانی جو متعلق ہے قلب سے

واضح رہے کہ قرآن حکیم نے "ایمانِ حقیقی" کا محل بھی قلب ہی کو قرار دیا ہے، جیسے کہ:

سورۂ حجرات میں (۱) اثباتاً صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (آیت ۷)

"بلکہ اللہ نے محبوب کر دیا ہے تمہارے نزدیک ایمان کو اور کھبا دیا ہے اسے تمہارے دلوں میں۔"

اور (۲)، تنہا بعض اعراب یعنی بدوؤں سے فرمایا:

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (آیت ۱۴) "اور تاحال نہیں داخل ہوا ایمان تمہارے دلوں میں!"

اب اگر ذرا ایمان کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اُس کے بھی دو پہلو ہیں: ایک[1] اُس کی وسعت اور پھیلاؤ کا مظہر ہے تو دوسرا[2] گہرائی اور گیرائی کا — مقدم الذکر کی تعبیر علمِ حقیقت سے ہوگی تو مؤخر الذکر کی یقین سے۔ پہلا رُخ کی تصحیح کرتا ہے اور "اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ"[1] اور "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"[2] کی جانب رہنمائی کرتا ہے تو دوسرا جذبہ وارادہ کو قوت و توانائی بخشتا ہے اور ایک[3] جانب "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ"[3] پر منتج ہوتا ہے تو دوسری[4] جانب "فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ"[4] اور "سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ"[5] اور "اُولٰٓئِكَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ"[6] کی صورت اختیار کرتا ہے — اس طرح گویا ایک[1] جانب منزل کے تعین یا "نیت کی درستی" اور دوسری[2] جانب "ارادے کی پختگی" یا "عزیمت" دونوں کا تعلق بالکلیہ قلب کے ساتھ ہے — البتہ آخری منزلِ مقصود کے علم اور عزم "یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید!" کے مصداق اُس تک رسائی کے عزمِ مصمم کے ساتھ ساتھ "سالک" کے لیے "راہ و رسمِ منزلہا" کی تفصیلات سے واقفیت، مدارج و مراحل کا صحیح علم اور سب سے بڑھ کر مطالبات و مقتضیات کا واضح فہم و شعور بھی ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ ان سب کا تعلق ذہن اور فکر سے ہے!

---

[1] الانعام: ۷۹ [2] الانعام: ۱۶۳ [3] البقرہ: ۱۶۵ [4] الذّٰریٰت: ۵۰ [5] الحدید: ۲۱
[6] المؤمنون: ۶۱

مسلمانوں کے موجودہ عملی زوال و اضمحلال میں اصل دخل تو یقیناً ایمان کے ضعف و اضمحلال ہی کو حاصل ہے تاہم بہت سے نیک دل اور خلیے کھرے مذہبی مزاج کے حامل لوگ بھی غیر فعال، ماحول سے مرعوب، اور حالات سے سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ؎ مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے ؛ اور ؎ "پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے!" کے مصداق صرف ذاتی زہد و تقویٰ یا ذکر و شغل یا عبادت و ریاضت میں مگن نظر آتے ہیں — اور نسبتاً فعال لوگ بھی دین کی کسی جزوی خدمت پر قانع نظر آتے ہیں جیسے محض تعلیم و تعلّم، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف یا محدود انداز کی خالص مذہبی تبلیغ جو یا تو فرقہ واریت کا منفی اُسلوب اختیار کر تی ہے یا اس سے بلند تر ہو کر مثبت ایمانی کیفیات کی دعوت کی صورت اختیار کرتی بھی ہے تو ایسے خالص غیر سیاسی انداز میں کہ ریاست و حکومت کے مسائل و معاملات کا ذکر بھی بالکل شجرِ ممنوعہ کی حیثیت اختیار کر لے اور بالخصوص تنظیم سے بُعد و اجتناب اور قیامِ جماعت یا نصبِ امارت سے فرار و نفور کی جو کیفیت جملہ مذہبی حلقوں میں نظر آتی ہے ———— تو اس کا اصل اور اہم ترین سبب یہ ہے کہ مقتضیاتِ ایمان کا واضح شعور اور دین کے فرائض و مطالبات کا جامع تصوّر حاصل نہیں ہے اور دین و ایمان کے بعض جزوی تقاضوں یا دین کے اصل مقاصد کے بعض جزوی لوازم کا فہم و ادراک ہے بھی تو اس شان کے ساتھ کہ ؎ "اڑائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے - چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!" اور اس پر طرّہ یہ کہ "كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ"[ک]

دینی فرائض اور ذمّہ داریوں کے واضح اور جامع تصوّر کے فقدان کا جو نتیجہ نکلتا ہے اسے سادہ ترین مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کو کہیں ملازم رکھا جائے اور اسے اس کے فرائض گن کر بتا دیئے جائیں، مثلاً دس[۱۰] کام اس کے سپرد کر دیئے

ک المومنون : ۵۳ والروم : ۳۲

جائیں تو اگر وہ کسی سبب سے اُن میں سے چھ یا سات کو بالکل بھول جائے اور صرف تین یا چار کام ہی اسے یاد رہ جائیں تو اس صورت میں خواہ وہ اُن تین یا چار کاموں پر کامل خلوص و اخلاص کے ساتھ اپنی پوری امکانی محنت ہی کیوں نہ صرف کر دے ملازم رکھنے والے کے نزدیک وہ نااہل اور غیر ذمہ دار ہی قرار پائے گا۔

بنا بریں جہاں وقت کی اہم ترین ضرورت اور "کرنے کا اصل کام" "تو یقیناً تجدید ایمان ہی ہے جو تجدید عہد کی اساس بنے اور جس سے یقین کی وہ دولت گرانمایہ حاصل ہو جس کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ ؎

یقین پیدا کر اے ناداں یقین سے ہاتھ آتی ہے وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اور اس کے نتیجے میں دین ہی پر جینے اور دین ہی پر مرنے کا قوی داعیہ اور پختہ ارادہ پیدا ہو، وہاں اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ واضح کیا جائے کہ اپنے ماننے والوں سے دین کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں؟ اور ایک مسلمان پر اُس کے دین کی جانب سے کیا کیا فرائض اور کون کون سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟

اس ضمن میں اس حقیقت کا ذکر تحصیل حاصل ہے کہ جہاں ایمان و یقین کا منبع اور سرچشمہ تو بالکلیہ ہے ہی قرآن حکیم، بقول مولانا ظفر علی خاں ؎ "وہ جنس نہیں ایماں جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے۔ ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآن کے سیپاروں میں" ——— وہاں مطالباتِ دین اور فرائضِ دینی کی تعیین کے ضمن میں بھی اصل اساس قرآن حکیم ہے، اگرچہ "کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآن" کے مصداق یہ معاملہ ایک پیکرِ محسوس و مشہود کی سُورت میں سامنے آتا ہے سیرت و سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرِ صحابہ رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے مطالعے سے ——— یہی وجہ ہے کہ ان سُطور کے عاجز و ناچیز راقم نے اوّلاً تو "مطالعۂ قرآن حکیم" کا وہ "منتخب نصاب" مرتب کیا تھا جس سے ایک جانب دینِ حق کے خدّوخال بتمام و کمال واضح ہو جاتے ہیں تو دوسری جانب مطالبات و مقتضیاتِ دین کا جامع تصوّر بھی اُبھر کر سامنے آ جاتا ہے ——— اور

الحمد للہ والمنۃ کہ اس کی زندگی کے گذشتہ اٹھارہ سالوں کے دوران اس کی توانائیوں کا اکثر و بیشتر حصہ اس کی نشر و اشاعت اور درس و تدریس میں صرف ہوا ہے۔ اور ثانیاً سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو بھی اس طور سے عام کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اس سے اتباع کا جذبہ ابھرے اور آپؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دین کے عملی تقاضوں کو ادا کرنے کا زوردار داعیہ پیدا ہو۔ اور ثم الحمد للہ کہ گذشتہ پانچ چھ سالوں کے دوران اس ضمن میں بھی اس عاجز و ناکارہ کو نہ صرف پاکستان کے طول و عرض بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بے شمار اجتماعات میں بیان و خطاب کی سعادت حاصل ہوئی ہے ——— اور اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے پاکستان ٹیلیویژن سے جہاں مسلسل پندرہ ماہ 'الہدیٰ' کے عنوان سے مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کا نصفِ اوّل بیان ہوا، وہاں 'رسولِ کاملؐ' کے عنوان سے مسلسل بارہ تقاریر کے ذریعے سیرت النبیؐ کے اس مطالعے کو بھی پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ——— اور الحمد للہ کہ یہ جملہ پروگرام نیشنل نیٹ ورک پر پاکستان کے تمام ٹی وی سٹیشنوں سے بیک وقت ٹیلی کاسٹ ہوئے ——— ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

اب یہ عاجز راقم اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے بھروسے پر دینی فرائض اور ذمہ داریوں کے ضمن میں اپنے اس مطالعۂ قرآن و سیرت کا حاصل اور لبِ لباب پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے ——— اس اُمید اور درخواست کے ساتھ کہ اس پر عوام اور خواص سب ہی غور فرمائیں ——— اور اگر میری کوئی غلطی اُن پر واضح ہو تو مجھے مطلع فرمائیں، میں اُن کا ممنونِ احسان ہونگا۔ اور اگر اُسے درست پائیں تو اُس کی تائید و تصویب بھی فرمائیں اور اُسے عملاً اختیار کرنے پر بھی سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ تاکہ "لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ" اور "لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ

بیّنۃ" کے مقاصدِ جلیلہ کے پورے ہونے کی صورت دوبارہ پوری شان اور آن بان سے پیدا ہو۔ وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ــــ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ ــــ اٰمِين يا ربّ العالمين ۝

جامع حنا کہ نہ کہ تفصیلی فہرست

فرائض و واجباتِ دینی کی کسی تفصیلی فہرست مرتّب کرنے کی کوشش ایک جانب نہایت طوالت طلب ہے اور دوسری جانب تحصیلِ حاصل! ــــ طوالت طلب اس لئے کہ ان کا سلسلہ شاخ در شاخ پھیلتا چلا جاتا ہے جیسے مثلاً نماز ایک اہم فریضۂ دینی ہے ۔ پھر دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں (بمقابلہ تہجّد اور اشراق وغیرہ کے جو نفلی ہیں) پھر ہر فرض نماز میں کچھ رکعتیں فرض ہیں باقی سنن و نوافل کے درجے میں ہیں، پھر ہر رکعت میں بعض تسامحات تو ایسے ہو سکتے ہیں جن کی تلافی سجدۂ سہو سے ہو جائے لیکن بعض ارکان و فرائض وہ ہیں کہ جن میں سے کوئی رہ جائے تو نماز کا لوٹانا لازم ہو گا ــــ مزید برآں نماز کے لئے طہارت شرط ہے جو حسبِ ضرورت غسل یا وضو یا اُن کے قائم مقام کی حیثیت سے تیمم سے حاصل کی جائے گی۔ گویا اپنے اپنے مقام و محل پر یہ بھی فرائض میں داخل ہیں، پھر غسل یا وضو کے لئے طاہر و مطہّر پانی اور تیمم کے لئے پاک مٹی شرط ہے تو گویا حسبِ ضرورت اُن کا حصول بھی لازم ہو گا ــــ اس طرح شاخ در شاخ کے علاوہ اصل فرائض پھر اُن کے لوازم، اور پھر اُن لوازم کے لوازم کا سلسلہ

بھی درجہ بدرجہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے! ——— اور تحصیل حاصل اسلئے کہ ان جزئی اور تفصیلی امور کے ضمن میں ضروری معلومات بحمد اللہ ہمارے علماء، مفتیانِ کرام اور مساجد کے ائمہ اور خطباء حضرات کی مساعی کے طفیل عوام کو بہت حد تک حاصل ہیں۔

جو کچھ اس سے قبل تمہیداً عرض کیا جا چکا ہے اُس کے پیشِ نظر اصل ضرورت اس کی ہے کہ فرائضِ دینی کا ایک ایسا جامع خاکہ پیش کیا جائے جسمیں تفصیلات کا رنگ ہر شخص خود بآسانی بھر سکے۔ اس لئے کہ بحالاتِ موجودہ اصل کمی دینی ذمہ داریوں کے اِسی جامع تصوّر کی ہے جو اُمّت کے دورِ زوال میں بہت سے اسباب وعلل کے باعث عوام ہی نہیں خواص تک کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا اور نوبت بایںجا رسید کہ اُس کی کوئی جھلک کبھی دکھائی دے بھی جائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک "بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ" کے مصداق اُمّت کی عظیم اکثریت اُس سے نامانوسیت ہی نہیں باقاعدہ اجنبیت اور مغائرت محسوس کرتی ہے ؎

"کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!"

تین فرائض، تین لوازم

قرآن حکیم اور سیرتِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مطالعے سے دین کے اساسی مقتضیات ومطالبات کا جو تصوّر میرے سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ہر ماننے والے سے دینِ حق تین بنیادی تقاضے کرتا ہے جو سادہ ترین الفاظ میں حسبِ ذیل ہیں:

ایک یہ کہ وہ خود امکانی حد تک دین پر کاربند اور عمل پیرا ہو۔

دوسرے یہ کہ وہ مقدور بھر دین کو دوسروں تک پہنچانے اور پھیلانے

کی کوشش کرے ۔ اور ۔ تیسرے ۔ کہ وہ دین کو قائم اور غالب کرنے کی سعی کرے ۔ اور جس طرح متذکرۃ الصدر مثال میں اصل فرض نماز ہے، لیکن اس کے لئے حسبِ موقع وحال غسل یا وضو یا بصورتِ عذر تیمم ضروری ہے اور اس کیلئے طاہر و مطہر پانی یا پاک مٹی کا حصول لازمی ہے اسی طرح دین کے مذکورہ بالا تین اساسی فرائض کے لئے بھی حسنِ اتفاق سے تین ہی چیزیں لوازم و شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں اس طرح گویا وہ بھی فرض ہی کے درجے میں ہیں — یعنی

ایک : دوام جہاد دوسرے : التزامِ جماعت

اور تیسرے : بیعتِ سمع وطاعت

اب میں کوشش کرونگا کہ ان چھ اُمور کی کسی قدر تشریح و وضاحت اصلاً کتاب اللہ اور تبعاً سُنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں کروں —

بیدہ التوفیق وعلیہ التکلان !

لیکن اس سے قبل کہ میں ان 'امورِ ستہ' کی وضاحت کروں، دو امور کی صراحت ضروری ہے : ایک متذکرہ بالا تین اساسی فرائض کی باہمی نسبت اور خصوصاً ایمان اور ارکانِ اسلام کے ساتھ ان کا ربط و تعلق اور دوسرے اُن کے ضمن میں کتاب وسنّت میں وارد شدہ اصطلاحات کا تعدد و تنوع ۔

اساسی فرائض کی باہمی نسبت اور ایمان اور ارکانِ اسلام سے ربط و تعلق

سب جانتے ہیں کہ 'حکمتِ دینی' کا ایک اہم شعبہ یہ بھی ہے کہ دین کے مختلف اجزاء کے مابین باہمی نسبت و تناسب کو اچھی طرح سمجھا بھی جائے

اور ہمیشہ پیشِ نظر بھی رکھا جائے ورنہ اس صورت کا پیدا ہونا فطری اور لازمی ہوگا جس کی جانب اشارہ فرمایا ہے حضرتِ مسیح علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اس حکیمانہ قول میں کہ "تم مچھر چھانتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو!" ——— چنانچہ دین کے بعض اہم اجزاء کے مابین اسی باہمی ربط و نسبت کی وضاحت کے لئے ایک تشبیہ اختیار فرمائی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اُس قولِ مبارک میں جسے روایت کیا ہے احمدؒ بزار، نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی رحمہم اللہ نے حضرتِ معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ سے کہ:

قَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ يَا مُعَاذُ بِرَأْسِ هٰذَا الْاَمْرِ وَذِرْوَةِ السَّنَامِ؟"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے معاذ! اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ اس معاملے یعنی دین کی جڑ اور چوٹی کیا ہے؟"

فَقَالَ: بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ فَحَدِّثْنِيْ! فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ رَأْسَ هٰذَا الْاَمْرِ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ قِوَامَ هٰذَا الْاَمْرِ اِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ

جس پر انہوں نے عرض کیا: "اے اللہ کے نبی، میرے ماں باپ آپ پر قربان، ضرور فرمائیے!" تب فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: "اس معاملے یعنی دین کی جڑ تو یہ ہے کہ تو شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور اس

الزَّكٰوۃَ وَاٰتٰ ذِرْوَۃَ السَّنَامِ مِنْهُ الْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ....." دین کو قائم رکھنے والی چیزیں نماز اور زکوٰۃ ہیں اور اس کی چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔"

اسی طرح دین کے جانب سے عائد شدہ ان تین اساسی ذمہ داریوں کے مابین باہمی نسبت و تناسب کیا ہے اور اس سے بھی اہم تر بات یہ کہ ان کا ایمان اور مشہور و معروف ارکانِ اسلام کے ساتھ ربط و تعلق کیا ہے اسے نہایت جامعیت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے ایک تین منزلہ عمارت کی تشبیہ سے جس کی پہلی منزل میں دیواریں نہیں ہیں بلکہ صرف چار ستون ہیں جن پر پہلی چھت قائم ہے البتہ دوسری اور تیسری منزلیں دیواروں سمیت مکمل تعمیر شدہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عمارت کی ایک بنیاد بھی ہے جس کا اکثر و بیشتر حصہ زیرِ زمین ہے اور نظر نہیں آتا، اگرچہ ہر شخص جانتا ہے کہ پوری عمارت کی پائیداری اور استحکام کا دار و مدار اسی پر ہے۔ اس بنیاد کا ایک تھوڑا سا حصہ وہ ہے جو سطحِ زمین کے اوپر ہے اور قدیم اصطلاح میں 'کرسی' اور جدید اصطلاح میں ' PLINTH ' کہلاتا ہے۔ اور اس کے اوپر قائم ہیں وہ چار ستون جنہوں نے تینوں چھتوں اور بالائی منزلوں کی دیواروں کا کامل بوجھ اٹھایا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ پوری عمارت اور بنیاد کے مابین کُل ربط و تعلق ان ہی کے ذریعے قائم ہے ——— اس تمثیل میں بنیادیں اور کرسی تو مشابہ ہیں ایمان سے، جس کے دو اجزاء ہیں: ایک باطنی یعنی "تصدیق بالقلب" یا یقینِ قلبی جو اصل زیرِ زمین بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی پر دین کی کُل عمارت کی پائیداری اور استحکام کا دار و مدار ہے ——— اور دوسرے "اقرار باللسان" یا کلمۂ شہادت جو ایمان کا مظہرِ خارجی ہے اور عمارت کی کرسی یا ' PLINTH ' کے مشابہ ہے ———

اور ہمیشہ پیشِ نظر بھی رکھا جائے ورنہ اس صورت کا پیدا ہونا فطری اور لازمی ہوگا جس کی جانب اشارہ فرمایا ہے حضرتِ مسیح علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اس حکیمانہ قول میں کہ "تم مچھر چھانتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو!" ——— چنانچہ دین کے بعض اہم اجزاء کے مابین اسی باہمی ربط و نسبت کی وضاحت کے لئے ایک تشبیہ اختیار فرمائی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قولِ مبارک میں جسے روایت کیا ہے احمدؒ بزار، نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی رحمہم اللہ نے حضرتِ معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ سے کہ:

قَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ يَا مُعَاذُ بِرَأْسِ هٰذَا الْاَمْرِ وَذِرْوَةِ السَّنَامِ؟"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے معاذ! اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ اس معاملے یعنی دین کی جڑ اور چوٹی کیا ہے؟"

فَقَالَ: بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ فَحَدِّثْنِيْ! فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ رَأْسَ هٰذَا الْاَمْرِ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ قِوَامَ هٰذَا الْاَمْرِ اِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ

جس پر انہوں نے عرض کیا: "اے اللہ کے نبی، میرے ماں باپ آپ پر قربان، ضرور فرمایئے!" تب فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: "اس معاملے یعنی دین کی جڑ تو یہ ہے کہ تو شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور اس

الزَّكٰوةِ وَاٰتٰي ذُرْوَةَ	دین کو قائم رکھنے والی چیزیں
السَّنَامِ مِنْهُ الْجِهَادُ	نماز اور زکوٰۃ ہیں اور اس کی
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ....."	چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔"

اسی طرح دین کے جانب سے عائد شدہ ان تین اساسی ذمہ داریوں کے مابین باہمی نسبت و تناسب کیا ہے اور اس سے بھی اہم تر بات یہ کہ ان کا ایمان اور مشہور و معروف ارکانِ اسلام کے ساتھ ربط و تعلق کیا ہے اسے نہایت جامعیت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے ایک تین منزلہ عمارت کی تشبیہ سے جس کی پہلی منزل میں دیواریں نہیں ہیں بلکہ صرف چار ستون ہیں جن پر پہلی چھت قائم ہے البتہ دوسری اور تیسری منزلیں دیواروں سمیت مکمل تعمیر شدہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عمارت کی ایک بنیاد بھی ہے جس کا اکثر و بیشتر حصہ زیرِ زمین ہے اور نظر نہیں آتا، اگرچہ ہر شخص جانتا ہے کہ پوری عمارت کی پائیداری اور استحکام کا دار و مدار اسی پر ہے۔ اس بنیاد کا ایک تھوڑا سا حصہ وہ ہے جو سطحِ زمین کے اوپر ہے اور قدیم اصطلاح میں 'کرسی' اور جدید اصطلاح میں ' PLINTH ' کہلاتا ہے۔ اور اس کے اوپر قائم ہیں وہ چار ستون جنہوں نے تینوں چھتوں اور بالائی منزلوں کی دیواروں کا کامل بوجھ اٹھایا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ پوری عمارت اور بنیاد کے مابین کُل ربط و تعلق ان ہی کے ذریعے قائم ہے ——— اس تمثیل میں بنیادیں اور کرسی تو مشابہ ہیں ایمان سے، جس کے دو اجزاء ہیں: ایک باطنی یعنی "تصدیقٌ بالقلب" یا یقینِ قلبی جو اصل زیرِ زمین بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی پر دین کی کُل عمارت کی پائیداری اور استحکام کا دار و مدار ہے ——— اور دوسرے "اقرارٌ باللسان" یا کلمۂ شہادت جو ایمان کا مظہرِ خارجی ہے اور عمارت کی کرسی یا ' PLINTH ' کے مشابہ ہے ———

چار ستونوں کی حیثیت حاصل ہے ان چار عظیم عبادات کو جو اللہ تعالےٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہیں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، اور جو کلمۂ شہادت کے ساتھ مل کر اسلام کے ارکانِ خمسہ کی صورت اختیار کرتی ہیں اور جیسے کہ مثال سے ظاہر ہے ان ہی پر قائم ہے پہلی چھت بھی اور دیوار دل اور چھتوں سمیت دونوں بالائی منزلیں بھی۔ ان میں سے پہلی چھت کی حیثیت حاصل ہے فریضۂ اولین یعنی "دین پر امکانی حد تک خود کاربند اور عمل پیرا ہونے" کو ـــ دوسری چھت نمائندگی کرتی ہے فریضۂ ثانی یعنی ـــــ "دین کو پھیلانے اور دوسروں تک پہنچانے کی کوشش" کی ـــــ اور تیسری اور بلند ترین چھت کی حیثیت حاصل ہے فریضۂ ثالث یا اس دُنیا میں انسان کی دینی مساعی کے آخری ہدف یعنی "دین کو قائم اور غالب کرنے کی جدّوجہد" کو

ساسی فرائض کے ضمن میں اصطلاحات کا تعدّد و تنوّع

یہ حقیقت بھی قرآنِ حکیم کے ہر طالب علم پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرآنِ حکیم کے مخصوص اسلوب میں بعد "اِک پھُول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!" کے مصداق "تصریفِ آیات" کے ساتھ ساتھ اصطلاحات کا تعدّد و تنوّع بھی بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس سے جہاں قرآن مجید کا ظاہری اور معنوی حُسن دو بالا ہوتا ہے اور اس کی ادبیت اور فصاحت و بلاغت کے اصل جوہر کھلتے ہیں وہاں کم فہم لوگوں کو کسی قدر دقّت بھی پیش آتی ہے اور غور و فکر کی صلاحیت سے عاری لوگوں کے لئے اصطلاحات کی

یہ گوناگونی اور رنگارنگی حیرانی کا موجب ہو جاتی ہے ۔ اور اسی حیرانی کے باعث قرآن حکیم کے اصل مطالبِ مدّعا کی ڈور کا سرا اُن کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے! حالانکہ ذرا توقف و تأمل اور ادنیٰ غور و فکر سے اصطلاحاتِ قرآنی کا یہی تعدّد و تنوع سے "گل ہائے رنگارنگ سے ہے رونقِ چمن ۔ اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے!" کے مصداق حکمتِ قرآنی کے ایک حد درجہ حسین وجمیل چمنستان کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ اور مختلف الفاظ کے استعمال سے متذکرہ بالا اساسی تقاضوں کے مختلف گوشے اس طرح نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں کہ کہیں کوئی ابہام یا اشکال باقی نہیں رہتا ———— تو آئیے کہ ہم دین کے ان تین بنیادی فرائض کے مختلف پہلوؤں کو ان اصطلاحات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کریں جو کتاب وسنّت میں ان کے لئے وارد ہوئی ہیں !! ۔

———— (بقیہ : مضاربت) ————

کو تو نفع کمانا ہوتا ہے خواہ کسی طریقے سے بھی ہو ۔

پھر چونکہ اسلام میں خرید و فروخت صرف ایسی چیزوں کی جائز ہے جو اپنی ذات کے اندر انسان کے لئے کوئی فائدہ رکھتی اور آدمی کی کسی طبعی و حقیقی ضرورت کو پورا کرسکتی ہوں، اور چونکہ کمپنیوں کے کاغذی شیئرز ایسی چیزوں کی تعریف میں نہیں آتے لہٰذا ان کی خرید و فروخت ناجائز قرار پاتی ہے' اور اگر ان کاغذی شیئرز کو کرنسی نوٹوں کی حیثیت دی جائے جو زر و نقدی کے حکم میں ہوتے ہیں تو پھر ان کی خرید و فروخت، زر و نقدی کے عوض زر و نقدی کی خرید و فروخت ہوگی جو صریح طور پر ربٰو ہے ۔

—— ختم شد ——

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ——— اور

بعثتِ محمدی کی تمامی و تکمیلی شان ——— نیز

انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ———

ایسے اہم موضوعات پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کی

حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۴ روپے

مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶۰ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

حقائق و معارف

اسرار احمد

حقیقتِ انسان

(۲)

یہ تو سب جانتے ہیں کہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ 'واجب الوجود' اور 'قدیم' ہے ——— جبکہ کُل کون و مکان اور انسان سمیت جملہ مخلوقات و موجودات 'ممکن' اور 'حادث' ہیں ——— لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ 'وجوب' سے 'امکان'، اور 'قِدم' سے 'حدوث' کا سفر کیسے اور کن مراحل سے گذر کر طے ہوا ——— اور آیا اس طویل سفر میں 'تنزّل' ہی 'تنزّل' ہے یا کوئی مرحلہ ارتقاء کا بھی آیا ہے ؟

اس مشکل بلکہ تقریباً لاینحل مسئلے کا ایک حل تو قدیم منطق اور فلسفے کے ماہرین نے کیا ——— کہ 'واجب' سے 'ممکن' اور 'قدیم' سے 'حادث' کے مابین "عقول عشرہ" اور "نُہ افلاک"[1] تصنیف کر ڈالے جن کے لئے کوئی دلیل نہ تجرباتی علم میں ہے نہ وحیِ آسمانی میں !

خود وحیِ آسمانی نے بھی اس کے ضمن میں نہ تفصیلی بحث کی نہ صراحت سے کام لیا بلکہ صرف 'اشارات' پر اکتفا کیا - اس لئے کہ اُس کا اصل مقصد 'ہدایت' اور 'صراطِ مستقیم' کی وضاحت ہے اور اس کے ضمن میں بھی اُس نے عوام کی ضروریات اور اُن کے فہم و شعور کی سطح کو زیادہ پیشِ نظر رکھا ہے اور دقیق حقائق و معارف کے ضمن میں اجمالی اشاروں پر اکتفا کی ہے،

---

[1] دس عقلیں اور نو آسمان !

کہ ـــــ "عاقلاں را اشارہ کافی است!"

البتہ "عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں!" کے مصداق وہ "علم الاسمار" جو آدمؑ کو ابتدا ہی میں عطا کر دیا گیا تھا، گویا نوعِ انسانی میں "بالقوہ" (POTENTIALLY) ودیعت کر دیا گیا تھا، ظہور و بروز کی بیشمار منزلوں سے گذر کر اب اس مقام تک پہنچ گیا ہے کہ "تخلیق" اور "تسویہ" کی تحقیق و تفتیش سے بڑھ کر "تکوین" یا "ایجاد و ابداع" کے در پر دستک دے!

وحیِ آسمانی 'تکوین' یا 'ایجاد و ابداع' کی اساس اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کُن" کو قرار دیتی ہے ـــــ بفحوائے آیاتِ قرآنیہ

(۱) وَ إِذَا قَضَىٰٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ٥ البقرہ: ۱۱۷

(۲) إِذَا قَضَىٰٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ٥ آل عمران: ۴۷

(۳) سُبْحَانَهُۥٓ إِذَا قَضَىٰٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ٥ مریم: ۳۵

(۴) فَإِذَا قَضَىٰٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ٥ المومن: ۶۸

یہ چاروں آیات تو تقریباً ہم معنیٰ ہیں ـــــ اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کے لئے اُس کا بس یہ کہنا کفایت کرتا ہے کہ "کُن" اور وہ ہو جاتی ہے ـــــ البتہ دو مزید آیات میں ذرا اطناب کا انداز ہے:

(۵) إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَىْءٍ إِذَآ أَرَدْنَٰهُ أَن نَّقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ٥ (النحل: ۴۰)	جب ہم کسی چیز کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اُس کے لئے بس ہمارا یہ کہنا ہی (کافی) ہوتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ ہو جاتی ہے!
(۶) إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن	اُس کے امر کی شان، تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرما

فَيَكُونُ ۝ (یٰسٓ : ۸۲)

لیتا ہے تو (بس یہ) کہتا ہے کہ (ہو جا) تو وہ ہو جاتی ہے -

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جہاں اللہ تعالیٰ کے فرامین و فرمودات، اوامر احکام، نوامیس و قوانین اور فیصلوں اور طے شدہ امور کو ”کلمات“ سے تعبیر کرتا ہے وہاں مندرجہ ذیل دو آیات میں اس کا پورا امکان موجود ہے کہ ”کلماتُ ربّی“ اور ”کلماتُ اللہ“ کے لاتعداد ہونے سے مُراد جہاں اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کا لامحدود ہونا ہو وہاں اُس تعالیٰ کی ’مخلوقات‘ کا ’لا یُحْصٰی‘ ہونا بھی ہو، اس لئے کہ فی الواقع اُس تعالیٰ کی ’مخلوقات‘ ہی اُس کے کمالِ علم، کمالِ حکمت اور کمالِ قدرت کی نشانیاں یعنی ”آیات“ ہیں —— اس معنی میں گویا ہر مخلوق اللہ کے ایک کلمہ ”کُنْ“ کا ظہور ہے :-

(۱) قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ۝ (الکہف : ۱۰۹)

”کہہ دو کہ میرے پروردگار کے کلمات کے لئے اگر سمندر روشنائی بن جائے تو وہ کبھی ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ میرے ربّ کے کلمات ختم ہوں - خواہ اس جیسا ایک اور سمندر لے آئیں مدد کیلئے!“

(۲) وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ - (لقمٰن : ۲۷)

”اور اگر زمین کے کل درخت قلم بن جائیں اور سمندر (سیاہی کا کام دے اور) اُس کے بعد سات سمندر اور ہوں مدد کیلئے، تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔“

مندرجہ بالا آیات کے عمومی اسلوب سے قطع نظر، قرآن حکیم میں اللہ تعالےٰ کی جملہ مخلوقات و ایجادات میں سے تعین کے ساتھ صرف حضرت مسیح علیہ السّلام کو 'کلمۃ اللہ' قرار دیا گیا ہے ــــــ جیسے سورۃ آل عمران کی آیت ۳۰ میں حضرت زکریاؑ کو حضرت یحیٰؑ کی ولادت کی خوش خبری کے ضمن میں حضرت یحیٰؑ کو " مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ " قرار دیا گیا ہے ــــــ اور ذرا آگے چل کر آیت نمبر ۴۵ میں حضرت مریمؑ کو حضرت مسیحؑ کی بشارت کے ضمن میں " إِنَّ اللهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ " کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں ــــــ اور اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۃ نساء کی آیت ۱۷۱ میں فرمایا گیا:

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ	" بے شک مسیح یعنی مریم کا بیٹا
مَرْيَمَ رَسُولُ اللهِ وَ	عیسٰی اللہ کا رسول ہے اور اس تعؔ
كَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى	کا 'کلمہ' جو القا فرمایا اس تعؔ نے
مَرْيَمَ ٥	مریم کی جانب!"

اُس کا سبب بظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ ہر شئی کی 'تخلیق' اور 'تسویہ' کے ساتھ ساتھ 'تقدیر' اور 'ہدایت' کا سلسلہ بھی قائم فرما دیتا ہے' بفحوائے

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ٥	" تسبیح کرو اپنے اُس رب کی
الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ٥	جو سب سے بالا و برتر ہے، جس نے
وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ٥	بنایا پھر سنوارا جس نے اندازہ
(الاعلیٰ: ۱تا۳)	ٹھہرایا پھر راہ معین کی"۔

یہی تقدیر و ہدایت ہے جو 'جمادات' کی سطح پر 'قوانین طبیعیہ' یعنی 'PHYSICAL LAWS OR LAWS OF THE NATURE' کی شکل اختیار کرتی ہے۔ نباتات کے معاملے میں خالص طبیعی قوانین پر حیاتیاتی قوانین (BIOLOGICAL LAWS) کا اضافہ ہوتا ہے، مزید آگے چل کر

'حیوانات' کے ضمن میں ان دونوں اقسام کے قوانین پر 'جبلّی قوانین' (INSTINCTS) کا اضافہ ہوتا ہے اور انسان کے معاملے میں ان تینوں پر اضافہ ہوتا ہے 'استدلالی قوانین' (RULES OF LOGIC) کا —— جس سے بالاتر سطح صرف 'وحیِ ربّانی' کی ہے! —— توجملہ مخلوقات کے معاملے میں جہاں تک معاملہ ان قوانین کے تحت چلتا رہے اللہ تعالیٰ کے کسی 'اضافی' امرِ 'کن' کی ضرورت نہیں ہوتی —— لیکن جہاں ان میں کوئی تبدیلی مطلوب ہو یعنی —— عمومی سلسلۂ اسباب و نتائج (CAUSE & EFFECT) یا 'عادی قانون' کو توڑ کر اللہ اپنی کسی مشیّتِ خصوصی کو ظاہر فرمانا چاہے (چنانچہ اسی کو 'خرقِ عادت' یا 'معجزے' سے تعبیر کیا جاتا ہے!) یا عام اسبابِ عادیہ کی کسی کڑی کو حذف کرنا ہو تو ایک اضافی کلمۂ 'کُن' اس کڑی کی جگہ لیتا ہے —— چنانچہ یہ ہے وہ صورت جو حضرت عیسیٰؑ کے معاملے میں پیش آئی کہ انسانی سلسلۂ تناسل جو عام طبعی اور حیاتیاتی قوانین کے مطابق 'مرد' اور 'عورت' کے "نطفۂ امشاج" سے شروع ہوتا ہے آنجنابؑ کے معاملے میں اسقدر بدل گیا کہ آپؑ کی پیدائش بن باپ کے ہوئی گویا ایک کڑی حذف ہوگئی اور اللہ کے ایک کلمۂ کُن نے ایک کڑی کی جگہ لے لی —— چنانچہ وہؑ "کَلِمَةٌ مِّنَ اللّٰهِ" یا "کَلِمَتُهٗ مِنۡهُ" یا "کلمۃ" قرار پائے۔

یہ بات 'متکلمین' کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ 'کلام' —— 'متکلّم' کی صفت ہوتا ہے —— اسی بنا پر علامہ اقبال نے قرآن حکیم کو "مِثلِ حق" قرار دیا ہے

"مِثلِ حق پنہاں وہم پیداست او زندہ و پایندہ و گویاست او!"

اور صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں یہ بات بھی بدیہی اور متفق علیہ ہے کہ وہ ذاتِ خداوندی کے مانند اطلاقی شان کی حامل ہیں —— رہی 'ذات' اور 'صفات' کی باہمی نسبت یعنی علامہ اقبال کے الفاظ

میں بھی " ہمیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جُدا یا عینِ ذات ہے " تو اس میں تقریباً لاینحل مسئلے کا حل بھی "لا عین ولا غیر" کے سوا اور کوئی نہیں ! (خواہ یہ بظاہر کتنا ہی مہمل نظر آئے !)

لہٰذا ذاتِ باری تعالیٰ وہ کلمۂ 'کُن' بھی جو موجودہ کون و مکان کے کل سلسلۂ تکوین و تخلیق کا نقطۂ آغاز بنا، ابتداء میں لازماً 'مطلق'، 'لامحدود' ——— اور 'کیف وکم' کے جملہ تصوّرات سے ماوراء تھا - البتہ اسی کلمۂ 'کُن' نے 'تنزّلات' کی منزلیں طے کرنی شروع کیں جن کے ذریعے 'وجوب' سے 'امکان' ——— اور 'قِدَم' سے 'حدوث' کی جانب سفر شروع ہوا !

گویا 'تنزّلات' کی نسبت ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب نہیں اس کلمۂ 'کُن' کی جانب ہے ! ——— یہی وجہ ہے کہ امام ربّانی حضرت مجدّد الفِ ثانی رح نے کُل کون ومکان اور جملہ موجودات و مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کے 'اسماء' اور 'صفات' کے 'اظلال' سے تعبیر فرمایا ہے !

اس مرحلے پر یوحنّا کی انجیل کے ابتدائی چند جملے بہت دلچسپی کا باعث ہوں گے ——— اگرچہ صاف نظر آتا ہے کہ وہ وحیِ ربّانی کی بجائے کسی فلسفیانہ اور متکلّمانہ ذوق کے حامل انسان کے ذہن سے نکلے ہیں :-

"ابتداء میں کلام تھا ——— اور کلام خدا کے ساتھ تھا ——— اور کلام خدا تھا، یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا ۔ سب چیزیں اسی کے وسیلے سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اُس میں سے کوئی چیز بھی اُس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی ۔"
(یوحنّا، باب اوّل : ۱ تا ۳)

قرآنِ حکیم کی اساسی اصطلاحات میں 'کلمہ' ہی کی طرح جامع اور گمبھیر اصطلاح 'امر' کی بھی ہے ـــــ بنیادی طور پر یہ قرآنِ مجید کے چند نہایت کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ہے۔ چنانچہ لفظِ 'امر' کہیں 'مسئلہ' یا 'معاملہ' کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، کہیں 'حکم' یا 'فیصلہ' کا مفہوم ادا کرتا ہے' کہیں 'اختیار' اور 'قدرت' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کہیں اُردو زبان کے کثیر المفہوم لفظ 'بات' کے معنی میں آتا ہے ـــــــ اور ان جملہ مفاہیم کے علاوہ اس کا ایک خاص 'اصطلاحی' مفہوم بھی ہے جس کے اعتبار سے یہ 'خلق' کا مقابل یا کم از کم 'مغائر' ضرور ہے۔ چنانچہ سورۃ اعراف کی آیت ۵۴ میں جہاں 'واوِ عطف' نے 'خلق' اور 'امر' کو اللہ کی ملکیتِ مطلقہ یا اختیارِ مطلق کے تحت 'جمع' کر دیا ہے وہاں ان دونوں کے مابین 'نسبتِ مغائرت' بھی قائم کر دی ہے:

اَلَا لَـهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط	آگاہ ہو جاؤ! کہ اُسی کے ہیں
تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہ	خلق اور امر (دونوں) بڑی برکت والا ہے
(الاعراف: ۵۴)	جو ربّ ہے تمام جہانوں کا!

اس 'امر' کے بارے میں دو باتیں نہایت اہم اور لائقِ توجہ ہیں!

ایک یہ کہ قرآنِ حکیم کی جن آیات میں "كُنْ فَيَكُوْن" کی تکوینی شان کا بیان ہوا ہے اُن سب میں بلا استثناء 'امر' ہی کا لفظ آیا ہے ـــــ 'خلق' کا لفظ کسی ایک جگہ بھی استعمال نہیں ہوا ـــــ یعنی یہ انداز کسی ایک جگہ بھی نہیں ملتا کہ 'اذا اردنا ان نخلق شیئاً فانما نقول لہ کُن فیکون' ـــــ اور قرآن کے مقامِ رفیع سے یہ بات بہت فروتر ہے کہ اسے محض ایک اتفاق مانا جائے، بقول غالب:

"گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیو جو لفظ کہ غالبؔ مِرے اشعار میں آوے!!"

اور ـــــ ؏ "زیر ہر ہر لفظ غالبؔ چیدہ ام میخانۂ!!"

دوسرے یہ کہ اس کا ایک نہایت گہرا اور قریبی تعلق لفظِ "روح" کیساتھ ہے۔ بفحوائے آیاتِ قرآنی :

(۱) وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (بنی اسرائیل : ۸۵)	اور وہ تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم میں سے ہے۔
(۲) يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (النحل:۲)	وہ فرشتوں کو اپنے امر کی روح کے ساتھ اتارتا ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے
(۳) يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۝ (المومن : ۱۵)	وہ ڈالتا ہے روح، جو اس کے امر میں سے ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔
(۴) وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ : ۵۲)	اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں سے دوسری اور تیسری آیات میں "اَلرُّوْحُ مِنْ اَمْرِهٖ" سے مراد بالاتفاق مطلقاً وحیٔ نبوت ہے، چوتھی آیت میں معین طور پر وحیٔ قرآنی کا ذکر ہے ـــــ پہلی آیت میں بھی بعض حضرات کے نزدیک مراد وحیٔ قرآنی ہی ہے ـــــ لیکن جمہور کے نزدیک اس سے مراد "روحِ انسانی" ہے ـــــ بہرحال سردست اصل قابلِ توجہ معاملہ "روح" اور "امر" کے مابین قریبی رشتے اور تعلق کا ہے!!!

اب اگر قرآن حکیم میں لفظِ "روح" کے دوسرے استعمالات و اطلاقات

پر غور کیا جائے تو جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے :

(۱) چار مقامات (البقرہ : ۸۷ و ۲۵۳ — المائدہ : ۱۱۰ — النحل : ۱۰۲) پر "روح القدس" کے الفاظ وارد ہوتے ہیں — اور ایک مقام (الشعراء : ۱۹۳) پر "الروح الامین" کے الفاظ آئے ہیں، اور ان تمام مقامات پر مراد غالب اکثریت کے نزدیک حضرت جبرئیلؑ ہیں!

(۲) دو مقامات (المعارج : ۴ اور القدر : ۴) پر "الملٰئکۃ والروح" کے الفاظ آئے ہیں اور ایک مقام (النبأ : ۳۸) پر "الروح والملٰئکۃ" کے — — اور اگرچہ بعض شاذ رائیں اور بھی پائی جاتی ہیں لیکن جمہور کے نزدیک یہ عام پر خاص یا خاص پر عام کے عطف کا معاملہ ہے — اور "الروح" سے مراد ان مقامات پر بھی حضرت جبرئیلؑ ہی ہیں! دوسرے نمبر پر رائے یہ ہے کہ اس سے مراد ہیں "ارواحِ انسانیہ"

(۳) سورۂ مجادلہ (آیت نمبر ۲۲) میں مومنین صادقین کے لئے اللہ تعالیٰ کی تائید کے ضمن میں "اَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ" کے الفاظ آئے ہیں جس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی "غیبی، مدد جو، جیسا کہ قرآن حکیم کے دوسرے مقامات (جیسے سورۂ انفال : ۱۲ اور سورۂ آل عمران ۱۲۴، ۱۲۵) سے معلوم ہوتا ہے اکثر ملائکہ ہی کے ذریعے بھیجی جاتی ہے۔

(۴) اپنی ذات مبارکہ کی جانب اضافت کی نسبت کے ساتھ لفظ "روح" کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں چھ مقامات پر استعمال فرمایا ہے : تین بار تخلیق انسانی کے ضمن میں کہ "تخلیق" اور "تسویہ" کے مراحل کی تکمیل کے بعد اُس میں اللہ نے "اپنی روح" میں سے پھونکا (السجدہ : ۹ — الحجر : ۲۹ اور ص : ۷۲) — — اور تین ہی بار حضرت مریمؑ کے ذکر میں — جن میں سے دو مقامات (الانبیاء : ۹۱ اور التحریم : ۱۲) پر حضرت صدیقہؑ کے بطن میں حضرت مسیحؑ کے استقرارِ حمل کے ضمن میں فرمایا گیا کہ "ہم

نے اپنی رُوح میں سے پھونکا'' — اور ایک مقام (مریم : ۱۷) پر بایں طور کہ جو فرشتہ انہیں حضرت مسیحؑ کی بشارت دینے کے لئے بھیجا گیا تھا اُسے ''رُوحنا'' (ہماری رُوح) سے تعبیر فرمایا گیا۔

(۵) آخری — اور موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے اہم ترین — یہ کہ سُورۂ نساء کی آیت ۱۷۱ میں جہاں حضرت مسیحؑ کو ''کلمۃ'' سے تعبیر فرمایا گیا — وہاں ''رُوحٌ مِنہُ'' بھی قرار دیا گیا!

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمۂ ''کُن'' — اُس کے ''امر'' اور لفظِ 'رُوح' کے مابین بڑا قریبی رشتہ و تعلق ہے — اور ملائکہ، ارواحِ انسانیہ، اور وحی کم و بیش ایک ہی قبیل کی حقیقتیں ہیں!

ملائکہ، ارواحِ انسانیہ اور وحی کے باہمی قُرب — اور ذاتِ باری سبحانہٗ و تعالیٰ سے اُن کے قریبی تعلق کو ظاہر کرنے والا ایک مزید لفظ 'نُور' ہے، چنانچہ:

(۱) یہ حقیقت تو اظہر من الشمس ہے کہ قرآن حکیم 'وحی' کو 'نور' قرار دیتا ہے جیسے سورہ مائدہ کی آیات ۴۴ و ۴۶ میں تورات — اور انجیل دونوں کو ''ھُدًی وَّنُوْرٌ'' سے تعبیر فرمایا گیا اور سُورۂ انعام کی آیت ۹۱ میں تورات کے لئے ''نُوْرًا وَّھُدًی لِّلنَّاسِ'' کے الفاظ وارد ہوئے — اسی طرح خود قرآن حکیم کے لئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی آیت ۱۵ میں ''نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ'' — سُورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷ میں ''النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗ'' — اور سورۂ تغابن کی آیت

۸ میں "وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا" کے الفاظ استعمال فرمائے!

(۲) فرشتوں کے بارے میں حدیثِ نبوی (مسلم عن عائشہؓ) میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ "اللہ نے انہیں نور سے پیدا فرمایا"

(۳) روحِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ایک مشہور حدیث میں جو اگرچہ محدثین کے معیارِ جرح و تعدیل پر تو پوری نہیں اترتی تاہم اکثر صوفیاء ہی نہیں مفسرین نے بھی اسے قبول فرمایا ہے۔ 'نور' ہی کا لفظ آیا ہے یعنی "اوّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ" —— اسی طرح ایک اور حدیث جس کا حوالہ تو تاحال دستیاب نہیں ہو سکا لیکن معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ مولانا غلام مرشد مرحوم اُسے اپنے دروس میں بیان فرمایا کرتے تھے، اُس کی رُو سے حضرتِ جابرؓ کے اس سوال کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا —— جواباً آنحضورؐ سے منقول ہے کہ "نُوْرُ نَبِیِّکَ یا جَابِرُ، نُوْرُ نَبِیِّکَ!!"

(۴) خود ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے، انسانی ذہن کی محدودیت اور نارسائی کے پیشِ نظر، قریب ترین لفظ جو طورِ تمثیل اختیار کیا گیا وہ 'نور' ہی ہے —— جیسے سورۂ نور کی آیت ۳۵ "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کے الفاظ مبارکہ —— اور حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول "نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ" کے الفاظ

ان حقائق کے پیشِ نظر کیا یہ نتیجہ نکالنا بعید از قیاس یا دُور کی کوڑی لانا قرار دیا جا سکتا ہے کہ

تخلیقِ کائنات کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے اولین کلمہ 'کُن' نے اپنے تنزّل کے مرحلۂ اوّل میں ایک نورِ بسیط کی صورت اختیار کی —— اور اس سے اللہ تعالیٰ نے خلعتِ وجود عطا فرمایا ملائکہ اور ارواحِ انسانیہ کو

جن کی اصل 'نور' ہے ــــ اور جو صاحبِ تشخص اور شعور ہی نہیں 'خود شعوری' کی نعمتِ عظمیٰ سے بھی سرفراز ہیں!

اور اس میں کونسے تعجب کی بات ہے کہ ان ملائکہ اور ارواحِ انسانیہ میں سب سے پہلے خلعتِ وجود سے سرفراز ہونے والی ہستی "نورِ محمدیؐ" ــــ یعنی "روحِ محمدیؐ" ہی ہو، ــــ فداہُ اٰبائُنا واُمّہاتُنا!!

واضح رہے کہ قرآنِ حکیم جیسے نہ صرف شعور بلکہ شعورِ ذات کی حامل ان دونوں انواع (یعنی فرشتوں اور ارواحِ انسانیہ) کو 'عالمِ امر' سے متعلق قرار دیتا ہے اسی طرح ان کے باہمی مخاطبہ و مکالمہ ــــ اور خود اللہ تعالیٰ کے اُن دونوں سے خطاب و کلام کو بھی ــــ جس کا اصطلاحی نام 'وحی' ہے 'عالمِ امر' سے متعلق قرار دیتا ہے ــــ اس موضوع پر قرآن کا 'ذروۂ سنام' یعنی اہم ترین مقام سورۂ شوریٰ کی آیات ۵۱ و ۵۲ ہیں:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ	اور کسی بشر کی بھی یہ شان نہیں
اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ	ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر
حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا	وحی کے ذریعہ سے یا پردے کی
فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ	اوٹ سے یا بھیجے کسی فرشتہ کو
اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ	پس وہ وحی کردے اس کے
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ	اذن سے جو وہ چاہے ۔ وہ بڑا
اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ	ہی عالی مقام بڑا ہی حکیم ہے
مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ	اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف
جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ	بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے

مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

امر میں سے نہ تم یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنا دیا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتے ہو۔ (۵۱-۵۲)

ان آیاتِ مبارکہ میں 'روح' — 'امر' — 'وحی' — اور 'نور' کے الفاظ مبارکہ جو ہماری اس پوری بحث کا مبنیٰ اور مدار ہیں جس شان سے وارد ہوتے ہیں، اس کی کوئی دوسری مثال اغلباً خود قرآن میں موجود نہیں ہے (واللہ اعلم!) ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان دو آیات کو اس موضوع پر قرآن حکیم کا 'ذروۂ سنام' قرار دیا ہے۔

(جاری ہے)

سلسلۂ تقاریر الٓمّٓر

سورۃ الحجر

ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓرٰ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُّبِينٍ. رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ. ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ. وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ. آمنت باللہ صدق اللہ العظیم۔

الٓرٰ سیریز کی آخری سورہ سورۃ الحجر ہے جو ۹۹ آیات اور ۶ رکوعوں پر مشتمل ہے اسی سورہ مبارکہ کے ضمن میں یہ حقیقت بڑی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید کی جو تقسیم پاروں کی صورت میں ہوئی ہے وہ دورِ نبوی اور دورِ صحابہ میں پائی نہیں جاتی تھی۔ بلکہ بعد میں کی گئی ہے جو نہایت ARBITRARY ہے چنانچہ اس سورہ مبارکہ کی صرف ایک آیت تیرھویں پارے میں ہے اور باقی پوری سورہ چودھویں پارے میں ہے یہ سورہ اپنے مضامین اور اپنے اسلوب دونوں کے اعتبار سے بالکل ابتدائی زمانے کی سورتوں سے مشابہ ہے۔ چنانچہ اسلوب کے اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں آیات چھوٹی ہیں ردھم (RYTHEM) تیز ہے اور صوتی آہنگ بہت نمایاں ہے مضمون کے اعتبار سے اس سورہ کے پہلے ہی رکوع میں منکرین کا ایک قول نقل ہوا ہے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہا یَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ " اے وہ شخص جس پر بزعم خویش یہ ذکر یعنی قرآن نازل ہوا ہے ہمارے

نزدیک تو تم مجنون ہو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ نقل کفر، کفر نباشد۔ یہ بات اس سے پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ حضور کی دعوت کے خلاف جو پہلا ردعمل ظاہر ہوا۔ وہ استہزاء اور تمسخر ہی کا تھا اس سورۂ مبارکہ کے آخیر میں بھی اس کا ذکر ہے چنانچہ آیت نمبر ۹۵ میں فرمایا گیا۔ اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَهْزِئِیْنَ یعنی اے نبیؐ آپ گھبرائیں نہیں ان استہزاء اور تمسخر کرنے والوں کے دفاع کے لیے ہم کافی ہیں اس آیۂ مبارکہ میں ایک لفظ "ذکر" آیا ہے وہ بہت قابلِ توجہ ہے نہ صرف اس آیت میں بلکہ اس کے بعد آیت نمبر ۹ میں پھر اس کا اعادہ ہوا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ "ذکر" ہم ہی نے آپؐ پر نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ان دونوں آیات میں اور قرآن مجید کی اور بھی بہت سی آیات میں قرآن حکیم کو "الذکر" قرار دیا گیا ہے یعنی یہی اصل ذکر ہے یہی کامل ذکر ہے۔ یہ سراپا اور مجسم ذکر ہے حدیث نبوی میں بھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ قول نقل ہوا ہے۔

وَ هُوَ الذِّکْرُ الْحَکِیْمُ ط

"یہ قرآن ہی ذکر ہے حکمت بھرا ذکر" یا ایک دوسرا مفہوم اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے۔ نہایت محکم، ذکر۔ بدقسمتی سے اس پہلو سے مسلمانوں نے قرآن مجید کی بڑی ناقدری کی ہے انہوں نے ذکر کے کچھ نئے نئے طریقے تو ایجاد کیے لیکن اس مجسم ذکر اس اصل ذکر اور اس مکمل ذکر سے بے اعتنائی کرتے چلے گئے۔ بقول علامہ اقبال ؎

وآئہ تذکرہ تارے دل نیست
کہ از بیش او آساں نیست

اسکو صرف حصول ثواب کے لیے اس کی تلاوت ہی کافی سمجھ لی گئی اور اسکا جو اصل مقصد تھا یعنی تذکیر، اسکو نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا۔ اس سورہ مبارکہ کے تیسرے رکوع میں تخلیق آدم اور قصۂ آدم و ابلیس کا ذکر ہے تخلیق آدم کا بیان اس سے قبل اس سلسلہ

کلام میں سورۂ ص میں آچکا ہے اور سورہ سجدہ میں بھی۔

یہاں جو چیز قابل توجہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے مادہ تخلیق کے لیے لفظ استعمال ہوا ہے صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ" اور یہ الفاظ تین مرتبہ استعمال ہوئے یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ قرآن مجید تخلیق انسانی کے ضمن میں مادہ تخلیق کی حیثیت سے مختلف الفاظ استعمال کرتا ہے کہیں تراب یعنی مٹی، کہیں طین یعنی گارا، کہیں طین لازب، وہ گارا جسمیں لیپ اُٹھ گئی ہو اور وہ چپکنے لگا ہو، کہیں حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ یعنی وہ گارا جو سڑ گیا ہو، کہیں صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ جیسے کہ اس سورہ میں تین مرتبہ آیا ہے یعنی سڑی ہوئی مٹی کا سوکھا گارا۔ اور سورہ رحمان میں الفاظ آتے ہیں " صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ " سڑی ہوئی مٹی کا وہ سوکھا گارا جو کھنکنے لگا ہو۔ غور کیا جائے تو اسمیں ایک مطابقت پائی جاتی ہے علم الحیات کے محققین نے اس روئے ارضی پر حیات کے آغاز کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں اور قرآن مجید کے اس طرز بیان میں نہایت مطابقت ہے حیات کا آغاز اس کرۂ زمین پر ان دلدلی علاقوں میں ہوا جو سمندر کے کنارے پر تھے جہاں مٹی ایک گارے کی صورت اختیار کرتی تھی کہیں وہ سوکھ جاتی تھی اور کبھی وہ پھر تر ہو جاتی تھی اور اس کی وجہ سے اسمیں خمیر اٹھا۔ پھر جب وہ دلدل خشک ہوتی ہے تو اس میں دراڑیں پڑتی ہیں اور یہی دراڑیں ہیں کہ جن میں جرثومۂ حیات نے آغاز کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

قصۂ آدم و ابلیس کے ضمن میں بھی اس سورۂ مبارکہ میں وہ بات پھر بہت زور شور کے ساتھ آئی کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے صاف فرمادیا۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ؕ

تمہیں میرے بندوں پر اختیار کوئی حاصل نہیں ہوگا۔ ہاں وہ لوگ جو خود ہی تمہاری پیروی کریں۔ جو خود سرکش ہوں، باغی ہوں، اور وہ تمہارا اتباع کریں، ان کو تم جدھر چاہنا لے جانا۔ یہی وہ بات ہے کہ جو اس سے پہلے اس مقام پر ہم دیکھ چکے ہیں کہ شیطان یعنی قیامت کے دن اپنے ان پیروؤں سے کہے گا کہ تم مجھے ملامت نہ کرو۔

فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَ لُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اپنے آپ کو ملامت کرو مجھے تم پر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا میں نے تمہیں ایک دعوت دی ایک بات کی طرف بلایا۔ اب یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے کہ تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ لہٰذا اب اپنے اس طرز عمل کی سزا خود بھگتو۔

اس سورہ میں انبیاء و رسل کے حالات و واقعات کے ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر بھی ہے لیکن جو کہ تفصیل کے ساتھ جو ذکر آیا ہے وہ حضرت لوط اور ان کی قوم کا اور پھر حضرت شعیب کی قوم کا بھی ذکر آیا ہے جنہیں یہاں اصحاب الایکہ کہا گیا۔

معلوم ہوتا ہے جہاں ان کی قوم آباد تھی یعنی مدین، اس علاقے میں کثرت سے جنگلات ہوں گے اور پھر بہت ہی برسبیل تذکرہ ذکر آیا ہے۔ قوم ثمود کا جنہیں یہاں اصحاب الحجر کہا گیا ہے ان تینوں اقوام کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے مسکن اس عظیم تجارتی شاہراہ پر واقع تھے جنہیں اس سورہ میں قرآن مجید "امام مبین" کہہ رہا ہے یعنی وہ کھلا راستہ کہ عرب سے شام کی طرف جانے والے تجارتی قافلے جس شاہراہ سے گزرتے تھے اس میں سب سے پہلے قوم ثمود کے مسکن اور ان کے کھنڈرات آتے تھے اس سے ذرا اور شمال کی طرف بڑھتے تھے تو مدین کا علاقہ آتا تھا جہاں قوم شعیب آباد تھی اس سے بھی ذرا اور شمال کی طرف بحیرہ مردار یعنی DEAD SEA کے کنارے پر وہ شہر آباد تھے جہاں وہ قوم آباد تھی جن کی طرف حضرت لوط علیہ السلام کو بھیجا گیا لہٰذا اس ترتیب سے اس سورہ میں ان اقوام کا ذکر ہے۔

اس سورہ کا آخری رکوع نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک بڑے مفصل خطاب پر مشتمل ہے اسمیں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو ہدایات دی گئیں اگر ان کو شمار کیا جائے تو اولین اور اہم ترین یہ کہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ یعنی اے نبی آپؐ استہزاء کافر نہ کیجئے، اس تمسخر کا، اس مذاق کا کوئی نوٹس نہ لیجئے آپؐ ان لوگوں کو نظر انداز کر دیں اور چشم پوشی سے کام لیں اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَهْزِءِیْنَ ہم کافی ہیں آپؐ کی طرف سے

دفاع کے لیے اور مدافعت کے لیے۔ دوسرا حکم یہ ہوا کہ اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ ہم نے اپنی سب سے بڑی نعمت آپ کو عطا فرما دی ہے جس سے بڑی دولت کا کوئی تصور ممکن نہیں

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ

"اور اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے آپؐ کو سات دی ہیں دہرائی جانے والیاں اور قرآن عظیم عطا فرمایا ہے" یہ سات دوہرائی جانے والیاں سورۂ فاتحہ کی آیات ہیں جن کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ان جیسی آیات نہ تورات میں نازل ہوئیں نہ انجیل میں اور نہ ہی ان کی کوئی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام واحسان ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر۔ اور آپؐ کی وساطت سے آپؐ کی امت کو اتنی بڑی دولت عطا فرمائی گئی بس کے حوالے سے اگلی ہدایت یہ دی گئی کہ اس دنیا میں ہم نے کچھ لوگوں کو عارضی دولت سے یعنی کچھ مال واسباب دنیاوی سے نوازا ہے آپؐ کی نگاہیں ہرگز ان کی طرف اٹھنی نہیں چاہئیں۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ

یہ مضمون سورۂ طٰہٰ میں بھی آچکا ہے جہاں یہ الفاظ مزید آئے تھے۔ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یہ دنیاوی زندگی کی چمک دمک ہے اس کی چہل پہل ہے لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ اور اس سے تو درحقیقت ہم نے انہیں فتنے میں مبتلا کیا ہے ہم انہیں آزما رہے ہیں یہاں فرمایا گیا

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ

اے نبی! اہل ایمان کے سامنے اپنے شانے جھکا کر رکھئے۔ آپؐ کی شفقت اور مودت ورحمت کے اصل حقدار وہی ہیں کہ جنہوں نے آپؐ کی دعوت پر لبیک کہا ایک اور حکم دیا گیا فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ اے نبی! اب آپؐ کی دعوت کا وہ دور شروع ہو جانا چاہیے کہ آپؐ ڈنکے کی چوٹ کہیں علی الاعلان کہیں کہ جس کا آپؐ کو حکم ہوا ہے۔ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسی حکم کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا پہلا خطاب عام فرمایا کوہ صفا پر چڑھ کر جسکو کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہاڑی کا وعظ۔ (SERMON OF THE MOUNT) قرار

مولانا اخلاق حسین قاسمی
مہتمم جامعہ رحیمیہ (دہلی)

قرآن کریم کا نظامِ عدل

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ۔ (النحل : ۹۰)

یہ آیت قرآن کریم کی وہ جامع آیت ہے جسے خطیبِ جمعہ ہر خطبۂ جمعہ میں تلاوت کرتا ہے۔ عبداللہ ابنِ مسعود رضؓ فرماتے ہیں، یہ آیت قرآن کریم کی جامع ترین آیت ہے۔ اس آیت کے چھ لفظوں میں شریعت کے تمام اوامر و نواہی، بُرائی اور بھلائی، خیر و شر کے پورے نظام کو اللہ تعالےٰ نے سمو کر اپنے بندوں کو عطا کر دیا ہے۔

ان چھ لفظوں میں بھی دو لفظ تشریحی ہیں، اس لیے صرف چار لفظ اصل مقصد کو بیان کر رہے ہیں۔

عدل کا لفظ نیکی اور بھلائی کی بہترین تعبیر ہے، ایک لفظ میں اگر فکر و عمل کی تمام بھلائیوں کو ظاہر کیا جائے تو اس کے لیے عدل سے بہتر کوئی دوسرا لفظ موجود نہیں ہے۔ عدل کے معنی انصاف ـــــ انصاف اپنے ساتھ، انصاف خدا کی تمام مخلوق کے ساتھ ـــــ یہی مذہبِ حق کی تعلیمات کا حاصل ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضؓ نے عدل کی تفسیر میں کلمہ توحید ـــــ لا الٰہ الا اللہ فرمایا، یہ عدل کا پہلا فکری اور ذہنی مفہوم ہے صرف خدائے واحد کے آگے سر جھکانا، اسی کو تمام صفات و کمالات کا مالک، منبع و سرچشمہ تسلیم کرنا اپنے ساتھ انصاف کرنا ہے ـــ اور اپنے ساتھ یہ سب سے بڑی بے انصافی ہے کہ اشرف المخلوقات،

اعلیٰ اور افضل ہستی ہوتے ہوئے اپنے سے پست اور ادنیٰ مخلوق کے آگے سر جھکائے یہ انسانی شرف و فضل کی سخت توہین ہے اور انسان کا اپنے اوپر سب سے بڑا ظلم ہے اسی لیے قرآن نے شرک کو ظلمِ عظیم قرار دیا ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۔ (لقمان ۱۳)

پھر عملی زندگی میں عدل اور اعتدال کی راہ اختیار کرنا، عدل کی ضد بے اعتدالی ہے بے اعتدالی کے کاموں میں پڑنا، مالک الملک کی عبادت اور اپنے نفس کی خواہشات، خدا کے حقوق اور بندوں کے حقوق دونوں کا درجہ بدرجہ خیال رکھنا۔ یہی عملِ صالح ہے اور اسی کا نام بندگی ہے۔

پس عدل کا لفظ عقیدہ اور عمل و اخلاق کی تمام بھلائیوں پر حاوی اور جامع ہے

احسان ۔ حسن سے ہے یعنی خوبی اور خوب صورتی ۔ یہ کمالِ عدل کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی کی جائے اور خوب صورتی اور حسن کے ساتھ کی جائے۔

انسان نیکی کرے لیکن اسے حسن و خوبی کے ساتھ نہ کرے تو یہ اس کی بے وقوفی ہے اور نیکی اور بھلائی کا حسن، ۔ اخلاص ہے، یعنی جو نیک کام کرے وہ بے لوث ہو کر کرے بے غرض ہو کر انجام دے ۔ صرف اپنے مالک کی رضا مندی کو مقصد بنائے ۔ اسی لیے حدیث میں احسان کی آخری منزل اور اخلاص کے آخری درجہ کی وضاحت کرتے ہوئے حدیث جبریل میں یہ بتایا گیا ہے :

اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ ۔ (مشکوٰۃ ۔ کتاب الایمان)

یعنی عبادت اور نیکی اپنے باطن اور اپنے دل کو ہر قسم کی دنیوی غرض سے اس طرح پاک صاف کر کے انجام دے کہ اپنے شفاف دل کے آئینہ میں اسے تصویرِ یار نظر آئے۔

رضاءِ حق کی طلب و اشتیاق اتنا شدید ہو کہ اسے جلوۂ حق نظر آنے لگے۔

تجربہ بتا رہا ہے کہ انسان جب کوئی کام پوری توجہ اور پورے انہماک و اشتیاق کے ساتھ کرتا ہے تو اس کی تمام ذہنی اور قلبی قوتیں ۔ قوۃ باصرہ، قوہ سامعہ اور

توقّف کر یہ اس فعل کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں، کوئی آواز دیتا ہے تو وہ اسے نہیں سن پاتا۔ اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے سامنے سے کون گذر گیا، کون آیا اور کون گیا۔ یہی کیفیت ہر عملِ خیر اور عبادت کے وقت انسان پر طاری ہو جائے تو وہ حسنِ عمل ہے۔ قرآن کریم نے نیکی کے اسی درجہ کو خدا کی محبت کا مستحق قرار دیا ہے۔

وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (البقرہ : ۱۹۵)

اللہ تعالٰی حسنِ عمل اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے — تم حسنِ عمل کی زندگی اختیار کرو۔

ایتاءِ ذی القربٰی — یہ عدل و نیکی کی ایک اہم قسم ہے۔ قرآن کریم نے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کی نیکی کو خاص طور پر اس لیے بیان کیا کہ مشرکینِ عرب اسلام قبول کرنے کے جرم میں اپنے رشتہ داروں کی رشتہ داری اور خون کے تعلق کو بھی فراموش کر رہے تھے اور اختلافِ رائے کی بنا پر خون کے رشتوں کو توڑ رہے تھے۔ اسی کی طرف آیت ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے۔

لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى

(شوریٰ آیت ۲۳)

اے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم! آپ فرما دیں کہ میں تم سے اپنی تعلیم و تبلیغ کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا، صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم آپس کی رشتہ داریوں کا احترام کرو، اسلام قبول کرنے کے جرم میں اپنے بھائی بندوں پر ظلم نہ کرو۔ عدل و نیکی کے عام حکم کے ساتھ ایک خاص نیکی کا تذکرہ مخاطب گروہ کے لحاظ سے تھا۔

الفحشاء، المنکر، البغی — برائی اور معصیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ گناہ جن کا تعلق باطن سے ہے جنہیں اخلاقِ رذیلہ کہا جاتا ہے — حسد، بغض، حرص، اور تکبّر وغیرہ — الفحشاء سے یہی برائی مراد ہیں۔

دوسری قسم میں وہ گناہ جن کا تعلق اعضاء و جوارح سے ہے — چوری، قتل، بدکاری وغیرہ اور فرائضِ دین کا ترک — یہ سب گناہ منکرات میں داخل ہیں۔

ایک معصیت بہت شدید ہے جس کا تعلق باطن اور ظاہر دونوں سے ہے

حق تلفی کا گناہ ہے۔ اسے قرآن نے البغی (زیادتی) سے تعبیر کیا ہے۔

یہ آیت کریمہ قرآنی بلاغت کا بہترین نمونہ ہے۔ اہل زبان اس بلیغ آیت کو سن کر ششدر رہ جاتے تھے اور ان کی زبان سے بے ساختہ قرآن حکیم کی معجزانہ بلاغت کا اعتراف نکل جاتا تھا۔

حضرت عثمان ابن مظعونؓ نے اس آیت کے نزول آسمانی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

رسول پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم صحن مکان میں تشریف فرما تھے کہ سامنے سے عثمانؓ گذرے، آپؐ نے انہیں بٹھا لیا اور ان کے ساتھ بات چیت میں مشغول ہو گئے۔ اسی اثنا میں آپ پر نزول وحی کے آثار شروع ہو گئے۔ کبھی آپؐ نے آسمان کی طرف نظریں بلند کیں اور کبھی اپنی دائیں جانب متوجہ ہو کر کسی ان دیکھی ہستی سے سر ہلا ہلا کر کچھ سمجھنا شروع کر دیا۔

یہ کیفیت دُور ہو گئی۔ عثمانؓ نے پوچھا، اے محمدؐ! یہ کیا کیفیت تھی جو میں نے دیکھی، آپؐ نے فرمایا مَا رَأَيْتَنِيْ مَا فَعَلْتُ؟ — کیا واقعی اے عثمان! تم نے سب کچھ دیکھا؟ — عثمانؓ بولے، جی ہاں، دیکھا! یہ اس وقت تک ایمان سے محروم تھے۔ آپؐ نے فرمایا: اَتَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ آنِفًا وَاَنْتَ جَالِسٌ، قَالَ فَمَا قَالَ لَكَ؟ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ الخ

میرے خدا تعالیٰ کا قاصد آیا تھا، تمہاری موجودگی میں، عثمان بولے، وہ کیا کہہ گئے؟ — فرمایا — یہ آیت کریمہ خدا کی طرف سے مجھ پر نازل کر گئے ہیں۔

عثمانؓ فرماتے ہیں: فَذَالِكَ حِيْنَ اسْتَقَرَّ الْاِيْمَانُ فِيْ قَلْبِيْ وَاَحْبَبْتُ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم — اس وقت میرے دل میں ایمان پیوست ہو گیا اور میں حضورؐ سے محبت کرنے لگا۔

حضرت عثمان نے باہر آ کر یہ آیت کریمہ قریش کے سردار ولید بن علقبہ کو سنائی، علقبہ کی زبان پر بے ساختہ یہ اقرار جاری ہو گیا۔

قبیلہ بنی صیف کے سردار اکثم ابن صیفی کے دو قاصد حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

فَقَالَا نَحْنُ رُسُلُ اَکْثَمَ ابْنِ صَیْفِیٍّ وَھُوَ یَسْئَالُکَ مَنْ اَنْتَ ؟
وَمَا اَنْتَ ؟

فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ — اَمَّا مَنْ اَنَا فَاَنَا مُحَمَّدٌ ابْنُ عَبْدِاللّٰہِ
وَاَمَّا مَا اَنَا فَاَنَا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ —

میرے منصب کا تعارف یہ ہے کہ میں خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔

پھر آپ نے آیت بالا تلاوت فرمائی۔ قاصدوں نے بار بار درخواست کرکے یہ آیت سُنی اور اسے یاد کر لیا۔

واپس آکر اپنے سردار کو ساری رپورٹ دی جس کا پہلا فقرہ یہ تھا:

اَبٰی اَنْ یَرْفَعَ نَسَبَہٗ فَسَاَلْنَا عَنْ نَسَبِہٖ فَوَجَدْنَاہُ اَزْکَی النَّسَبِ وَسَطًا فِیْ مُضَرَ۔

محمد ﷺ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنے خاندان اور حسب ونسب پر کوئی فخر نہیں کیا، ہم نے لوگوں سے ان کے خاندان کے متعلق سوال کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ اعلیٰ نسب کے مالک ہیں، پاکیزہ نسب رکھتے ہیں اور خاندان مضر کی بہترین شاخ بنی ہاشم کے فرد ہیں۔

پھر ان قاصدوں نے وہ آیت کریمہ تلاوت کی۔ اکثم نے یہ ساری رپورٹ سن کر کہا۔

اِنِّیْ اَرَاہُ یَاْمُرُ بِمَکَارِمِ الْاَخْلَاقِ وَیَنْھٰی عَنْ مَلَائِمِھَا فَکُوْنُوْا فِیْ ھٰذَا الْاَمْرِ رُؤُسًا وَلَا تَکُوْنُوْا ذُنُبًا۔

میں سمجھتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں، اور برے کاموں سے روکتے ہیں، پس اے میری قوم!

وَاللّٰہِ اِنَّ لَہٗ لَحَلَاوَۃً وَاِنَّ عَلَیْہِ لَطَلَاوَۃً وَاِنَّ اَعْلَاہُ لَمُثْمِرٌ وَاِنَّ اَسْفَلَہٗ لَمُغْدِقٌ وَمَا ھُوَ قَوْلُ الْبَشَرِ۔

بخدا! یہ بے حد شیریں کلام ہے، یہ بڑا تروتازہ ہے۔ اس کا اوپر کا حصہ بھی پھل دار ہے اور اس کا نچلا حصہ بھی پھل دار ہے۔

قبیلہ بنی صیف کے سردار اکثم بن صیفی نے اپنے دو قاصد حضور علیہ السلام کی خدمت میں بھیجے تاکہ وہ ان کے پیغام کو سمجھیں۔

ان قاصدوں نے حاضرِ خدمت ہو کر حضورؐ سے سوال کیا۔
نَحْنُ رُسُلُ اَکْثَمَ ابْنِ صَیْفِیٍّ وَھُوَ یَسْاَلُکَ مَنْ اَنْتَ ؟ — وَمَا اَنْتَ ؟
ہمارے سردار سوال کرتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟ اور آپ کیا ہیں:
پہلا سوال شخصی تعارف کے لیے تھا اور دوسرا سوال آپؐ کے منصب اور عہدہ کی تحقیق سے متعلق تھا۔ آپؐ نے فرمایا:
اَمَّا مَنْ اَنَا، فَاَنَا مُحَمَّدُ ابْنُ عَبْدِ اللّٰہِ — وَاَمَّا مَا اَنَا فَاَنَا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ — میری شخصی حیثیت یہ ہے کہ میں عبداللہ کا لڑکا محمدؐ ہوں۔ تم لوگ ان پر ایمان لانے میں جلدی کرو، اس اہم کام میں سبقت حاصل کر کے اونچے ہو جاؤ، پیچھے نہ رہو۔

یہی وہ آیت پاک ہے جسے سُن کر حضرت ابوذر غفاری ایمان لے آئے — ابوذر اپنے قبیلہ کے بڑے سردار تھے اور یہ قبیلہ ڈکیتی کرنے میں مشہور تھا۔ ان کے بھائی انیس نے جا کر ابوذر کو رپورٹ دیتے ہوئے کہا تھا:
محمدؐ اپنے لیے کچھ نہیں کہتے، وہ صحن حرم میں بیٹھ کر لوگوں کو اخلاق حمیدہ کا درس دیتے ہیں۔

اس آیت کے اس اسلوب نے آیت کے اثر کو زیادہ بڑھا دیا ہے کہ شروع میں کہا۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ — اور آخر میں کہا۔ یَعِظُکُمْ — خدا حکم دیتا ہے۔ وہی نصیحت کرتا ہے، میں تو اس کے حکم اور اس کے پیغام کا داعی اور مبلغ ہوں۔ امر و نصیحت کا حق اسی کو حاصل ہے، نہ اس سے بڑا کوئی حکمران ہے جو حکم دینے کا حق رکھتا ہو اور نہ اس سے زیادہ اپنے بندوں کا کوئی خیر خواہ ہے جو انہیں اچھی نصیحت کرے۔ (ابن کثیر ج ۲ ص ۵۸۳)

عدل اور قانونِ فطرت

قرآن حکیم نے قوانین فطرت کو عدل و میزان سے تعبیر کیا ہے اور انسانوں کو بار بار کائنات ہستی میں کارفرما عدل و توازن کی طرف توجہ دلائی ہے۔
وَالسَّمَآءَ رَفَعَھَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ۔ (الرحمٰن : ۶)

رحمت والے خالق نے آسمان کو بلندی عطا کی اور اس میں عدل و توازن قائم کیا۔
اس کارخانہ ہستی کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ اس کے ہر شعبہ میں بناؤ، سلجھاؤ، خوبی و زیبائی کا جو دلفریب منظر نظر آتا ہے وہ اسی عدل و توازن اور تناسب و تعادل کا کرشمہ ہے۔ نظام شمسی کا ہر کرہ اپنی اپنی جگہ گردش میں ہے۔ اور اپنے اپنے مقررہ دائروں میں حرکت کر رہا ہے۔ ہر کرہ اپنی ایک خاص کشش رکھتا ہے اور اسی جذب و کشش کے تناسب و توازن سے یہ نظام قائم و جاری ہے۔ اگر کوئی کرہ اس قانونِ عدل سے ذرہ برابر تجاوز کرے تو تمام نظام شمسی درہم برہم ہو جائے۔

یہ قانون عدل و اعتدال ہی وہ نظر نہ آنے والا ستون ہے جس پر یہ آسمان قائم ہیں خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ۔ (لقمان - ۹) "اس نے آسمانوں کو بنایا بغیر ستون کے، تم اس حقیقت کو دیکھ رہے ہو"۔ آسمان کی بلندی کے ساتھ ترازو کا قائم کرنا، نادان لوگوں کو بے جوڑ معلوم ہوتا ہے، وہ اسے قرآن حکیم کے بے ربط اور بے جوڑ کلام ہونے کے استدلال میں پیش کرتے ہیں لیکن یہ قرآن کریم کے سطحی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

قرآن کریم اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ یہاں المیزان سے معروف ترازو مراد نہیں ہے، بلکہ قانونِ عدل مراد ہے، ترازو تولنے اور انصاف کرنے کا مشہور عوام آلہ اور ذریعہ ہے، قرآن کریم المیزان بول کر توازن و تناسب کے فطری قوانین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ارباب تراجم میں آخری دور کے دو مترجم صاحبان نے المیزان کا ترجمہ نہیں کیا، المیزان قائم کیا، ترجمہ کیا ہے۔ یہ دو مترجم مولانا ابوالکلام اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔

ان حضرات کے سامنے قرآنی معارف کے ساتھ ساتھ قرآن کریم پر کیے جانے والے اعتراضات بھی تھے۔

اُردو کے مشہور دین بے زار ادیب نیاز فتحپوری کا یہ مشن رہا ہے کہ وہ قرآن کریم کو کلامِ رسول قرار دیتے تھے کلام اللہ تسلیم کرنے سے انہیں انکار تھا۔
نیاز صاحب کے عامیانہ اعتراضات میں یہ اعتراض بھی شامل تھا کہ آسمان کی رفعت

اور ترازو رکھنے کا باہمی کیا جوڑ ہے — یہ کلام الٰہی کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن ایک مقفیٰ اور مسجع کلام ہے جسے رسولِ عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نہایت اعلیٰ عربی ادب میں مرتّب کیا (معاذ اللہ)۔

ایک باکمال شاعر بھی وزن شعری کو برقرار رکھنے کے لیے بعض اوقات کمزور الفاظ رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس طرح غالب ایک باکمال شاعر تھا وہ کہتا ہے ؎

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے میری بالیں پہ اسے پر کس وقت

بقول نیاز صاحب، قرآن کریم کے مرتّب و مؤلف بھی الرحمان — کا قافیہ قائم رکھنے کی خاطر قرآن، الحسبان، یسجدان کے ساتھ المیزان لائے، غالب بھی کھولنے کے فصیح لفظ کو چھوڑ کر مند گئیں کا غیر فصیح لفظ لانے پر مجبور ہوئے۔

قرآن کریم کے بارے میں اس طرح کے خیالات مغرب کے بعض کم نظر ناقدین نے قائم کیے۔ اور پھر ہندوستان کے ان کم نظر نقالوں نے انہیں دہرایا۔ ان کا مقصد محض سستی شہرت حاصل کرنا تھا۔

قرآن کریم نے کتاب کے ساتھ میزان قائم کرنے کا ذکر دو مقام پر کیا:

الحدید (۲۵) میں کہا گیا:

وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

ہم نے ان رسولوں کے ساتھ الکتاب اور المیزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف قائم کریں۔

الشوریٰ (۱۷) میں کہا گیا:

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ۔

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے کتاب اور میزان نازل کی انصاف قائم کرنے کے لیے۔

امام مجاہد اور قتادہ آیت شوریٰ میں المیزان کی تفسیر العدل والانصاف سے کر رہے ہیں اور اس تفسیر کے استدلال میں الحدید اور الرحمان کی مذکورہ آیات پیش کر رہے ہیں۔ (ابن کثیر ج ۴ ص ۱۱۰)

المیزان کا لفظ جہاں پورا تولنے اور پورا ناپنے کے سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے

وہاں اس کے معنی ترازو کے ہیں۔

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے المیزان کے مفہوم کو عام رکھتے ہوئے حسب ذیل تشریح کی ہے :

اللہ نے مادی ترازو بھی اتاری جس میں اجسام تلتے ہیں اور علمی ترازو بھی جسے عقلِ سلیم کہتے ہیں اور اخلاقی ترازو بھی جسے صفتِ عدل و انصاف کہا جاتا ہے اور سب سے بڑی ترازو دینِ حق ہے جو خالق و مخلوق کے حقوق کا ٹھیک ٹھیک تصفیہ کرتا ہے اور جس میں بات پوری تلتی ہے، نہ کم نہ زیادہ (حمائل ۶۲۹)

قرآن حکیم نے جمالِ فطرت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ موزونیت اور تناسب ہی کی کارفرمائی ہے۔

وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ (الحجر ۱۹)

اور ہم نے زمین پر ہر ایک چیز نہایت موزونیت کے ساتھ اگائی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمانِ فطرت قلم اس طرح گوہر افشانی کرتا ہے۔

" زمین میں جتنی نباتات اُگتی ہیں سب کے لیے حکمتِ الٰہی نے ایک خاص اندازہ ٹھہرا دیا ہے، ہر چیز اپنی نوعیت، اپنی کمیت، اپنی کیفیت میں ایک جچی تلی حالت رکھتی ہے جس سے کبھی باہر نہیں جا سکتی، ممکن نہیں کہ گھانس کی ایک شاخ بھی ایسی اُگ آئے جو گھانس کے مقررہ اندازہ اور تناسب کے خلاف ہو۔ گویا مٹی کے ایک ایک ذرہ میں ایک ایک ترازو رکھ دیا گیا ہو اور وہ ایک ایک دانے، ایک ایک پتے، ایک ایک پھول کو تول تول کر بانٹ رہا ہو ممکن نہیں کہ اس تول میں کبھی خرابی پڑے"

(ترجمان جلد ۲ صہ ۳۰۳)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامِ عدل کو اپنی زندگی کا مشن قرار دیتے ہوئے فرمایا : وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (الشوریٰ) میں اس بات پر مامور ہوں کہ تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔

اس حکم سے پہلے حضورؐ کو حکمِ الٰہی پر استقامت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔

وَ اسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۔

اے نبی! تم ان کی خواہشات پر نہ چلنا اور حکمِ الٰہی کی تعمیل پر استقامت اختیار کرنا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اس آیت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

"مجھے اس طرح کی آیات نے بوڑھا کر دیا۔"

قرآن سماجی عدل کی اہمیت واضح کرنے کے لیے (الانعام (۵۲)) میں رسول اکرم علیہ السلام کو خطاب کر کے کہتا ہے:

فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظّٰلِمِينَ

ان مغرور سردارانِ قریش کی خواہش پر اگر آپ نے فقراء و مہاجرین کو اپنی مجلس سے اٹھایا تو آپ ظالموں میں شمار ہوں گے۔

سردارانِ قریش اپنے آزاد شدہ غلاموں بلال صہیب اور عمار جیسے نادار مسلمانوں کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھنے کو معیوب سمجھتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اگر ہمیں قرآن کریم سنانے کے لیے بلانا ہے تو اے محمدؐ آپ ان حقیر مسلمانوں کو مجلس سے اٹھا دیا کریں۔

خدا تعالیٰ نے اس سماجی اونچ نیچ کے تصور کو عدل کے خلاف قرار دے کر حضورؐ کو ظلم کا ارتکاب کرنے سے روک دیا۔

معاشی اور اقتصادی عدل کے قیام کی اہمیت واضح کرتے ہوئے قرآن حکیم نے کہا:

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي وَمَنْ يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوٰى ۔ (طٰہٰ : ۸۱)

لوگو! خدا تعالیٰ کی پاکیزہ روزی میں سے کھاؤ اور پیو، اور اس میں زیادتی نہ کرو، اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر میرا غضب نازل ہو جائے گا، اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ تباہ ہوا۔

عدل کی ضد جس طرح ظلم ہے اسی طرح طغیان ہے۔ ظلم کے معنی کسی چیز کو بے محل رکھ دینا اور طغیان کے معنی کسی چیز کا اپنی مناسب حد سے آگے بڑھنا

دونوں صورتیں عدل کے منافی ہیں ـــ کھانے پینے میں زیادتی کی دونوں صورتیں ہیں اسراف کرنا اور بخل کرنا ـــ دونوں صورتیں عدل کے خلاف ہیں۔

شاہ عبدالقادر نے اس آیت میں شانِ نزول کی رعایت کرتے طغیان کی ایک صورت کو متعین کیا۔

حاشیہ پر لکھتے ہیں :

" زیادتی نہ کرو یعنی رکھ نہ چھوڑو "

اوپر سے بنی اسرائیل کا ذکر آ رہا ہے۔ یہ لوگ دولت کو جمع کر کے رکھتے تھے۔ خدا کے بندوں کی خدمت اور ضرورت پر خرچ کرنا ان کی عادت کے خلاف تھا۔ اس سیاق و سباق کی وجہ سے شاہ صاحب نے ایک صورت کو متعین کیا۔ لیکن قرآن کریم ہر قسم کی بے اعتدالی کو مذموم قرار دے رہا ہے۔ جو اصحاب ثروت اپنی دولت کو ـــ جو حقیقت میں ان کے پاس امانت ہے۔ خدا کی راہ میں ضرورت کے مطابق صرف نہیں کرتے اور صرف واجبی انفاق۔ زکوٰۃ ـــ کو کافی سمجھتے ہیں وہ سرکشی کے مرتکب ہیں۔

حضرت ابن عباس رضؓ نے ـــ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ : ۲۱۹) میں عفو کا مطلب زائد از ضرورت قرار دیا ہے۔

دولت مندوں کی یہ سرکشی یا اس لیے رونما ہوتی ہے کہ وہ اپنی کمائی کو اپنے ذاتی تعیشات پر صرف کر کے برباد کر دیتے ہیں یا اس لیے رونما ہوتی ہے کہ وہ مال و دولت کو کنز کرنے اور جمع کر کے رکھنے کے شوقین ہوتے ہیں، نہ اپنی اور اہل و عیال کی جائز ضرورتوں میں خرچ کرتے ہیں اور نہ ان کی دولت قومی مفاد میں کام آتی ہے۔

قرآن کریم نے سب سے بڑا سرکش اُس حاکم و حکمران کو قرار دیا ہے جو اسلام کے قانونِ عدل کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کے مطابق فیصلے صادر کرے اور اس کے لیے قرآن نے طاغوت کا لقب اختیار کیا ہے۔

طاغوت طغیان سے مبالغہ کا صیغہ ہے جو عادل کی ضد ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ (النساء : ۶۰)

یہ لوگ طاغوت کے پاس اپنے جھگڑے اور فیصلے لے جاتے ہیں۔
طاغوت کے مبالغہ کا جو جامع اور وسیع مفہوم ہے اسے اردو زبان کا کوئی ایک لفظ ادا کرنے سے قاصر ہے۔
شاہ عبدالقادر صاحب نے ایک آیت میں اس کا ترجمہ ہڑدنگے کیا ہے۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں ہڑدنگا، مفسد، شرارتی، بدتمیز، خبطی اور بدحواس انسان کو کہتے تھے۔ (فرہنگ آصفیہ) شاہ صاحب نے اس وسیع المعانی لفظ سے اس کا مفہوم ادا کیا۔

ارباب تراجم نے اس کے مرادی معنی میں بت، باطل معبود اور شیطان و سرکش کے الفاظ لکھے ہیں۔

(بقیہ: الٓمّٓ)

دیا جاسکتا ہے اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے اے نبیؐ! ہمیں خوب معلوم ہے کہ آپؐ کو اس سے اذیت پہنچتی ہے آپ کا سینہ مبارک اس سے کچھ بھنچتا ہے جو مخالفت یہ کر رہے ہیں اور جو طرح طرح کی باتیں یہ بنا رہے ہیں لیکن آپؐ ان کی پرواہ نہ کیجیے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ۔

آپ اپنے رب کی تسبیح وتہلیل میں مشغول رہیں اسکے سامنے سربسجود رہا کریں۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ

اور اپنے رب کی عبادت میں سرگرم رہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس آپؐ کے رب کا بلاوا یعنی موت کا پیغام آ پہنچے۔ یہ ہدایات نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہیں بلکہ آپؐ کے نقش قدم پر چلنے والے وہ تمام اُمتی جو دعوت الی اللہ کا فریضہ سرانجام دیں، ان کے لیے بھی یہ ابدی ہدایات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس کی توفیق عطا فرمائے اور ان ہدایات سے نفع حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم
ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعلیم سے صحیح نتائج کیسے حاصل ہونگے؟

زوالِ تعلیم کا رونا رونے والے توجہ فرمائیں

چند دردمندانہ تجاویز

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

انسانی اور اسلامی نقطۂ نظر سے علم و تعلیم کی اہمیت ایک مسلم امر ہے۔ اللہ رب العزت نے نسلِ انسانی کے جدِ بزرگوار حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا، زندگی بخشی اور پھر سب سے پہلے انہیں "علم" کی دولت بے کراں سے سرفراز فرمایا وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ (البقرہ ۳۱) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے بلکہ آیت کریمہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ انسان کے لئے پہلے معلم خود حضرت حق تھے (جل وعلا مجدہ) حضرات انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کو جانچا جائے تو انہیں جو امتیازی خوبیاں نظر آتی ہیں ان میں "علم و تعلیم" سب سے بڑھ کر ہیں کیونکہ وہ دنیا میں حق کا راستہ دکھانے اور مالکِ حقیقی کی شناخت کرانے کو ہی آتے تھے، اس لئے لازم تھا کہ وہ اس چیز میں ممتاز ہوتے جو اس کا ذریعہ اور وسیلہ ہے، مشہور بات ہے بے علم نتواں خدا را شناخت۔

بالخصوص جب حضرت نبی کریم علیہ السلام کی حیات مبارکہ پر نظر ڈالی جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کے لئے دعا مانگی سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے تو اس میں يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (البقرہ ۱۲۹) کی درخواست کی اور اللہ تعالیٰ نے اُنہی خوبیوں کے ساتھ ممتاز و متصف کرکے اُنہیں دنیا میں بھیجا جیسا کہ آل عمران ۱۶۴ اور الجمعہ ۲ میں موجود ہے۔ اُن پر جو کتاب مقدس نازل ہوئی

اس میں علم اور اہل علم کی تعریف و توصیف میں بہت کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے جس کی تفصیل کا یہ وقت نہیں، اہل ذوق الزمر، المجادلہ اور السبا کو ملاحظہ فرمالیں۔

نبی کریم کی حیات مبارکہ میں تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں جو انہماک اور جدوجہد نظر آتی ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے دار ارقم سے لے کر صفہ تک کی درسگاہیں کافی ہیں جو براہ راست نبی کریم علیہ السلام کی نگرانی و سرپرستی میں چل رہی تھیں۔

معلم کتاب و حکمت نے علمی طور پر جو اسپرٹ اپنے نام لیواؤں میں پیدا کی اسکی داستان بے حد طویل ہے اور نہ صرف خلافت راشدہ بلکہ بعد کے ہر دور میں سلاطین اسلام نے اس شعبہ زندگی کو بے حد اہمیت دی، علماء کی کاوشیں اس پورے دور میں اپنا ایک مقام رکھتی تھیں تو اہل ثروت کا ذوق علم پروری اور غرباء کی معارف پروری کا اپنا ایک انداز ہے اسلام اور مسلمانوں کا کوئی بدترین دشمن یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں نے کسی دور میں اس انتہائی اہم اور ضروری شعبہ سے بے اعتنائی برتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جب مسلمان قوم سیاسی طور پر زوال و ادبار کا شکار ہو گئی تب بھی اس نے انتہائی ایثار و ہمت کر کے علمی سرگرمیوں کو جاری رکھا، بالخصوص برعظیم ہند و پاک کی اس گذشتہ دو سو سالہ تاریخ کو دیکھیں تو آپ کو یہ اندازہ کرنا آسان ہو جائے گا کہ اس ستم رسیدہ قوم نے دنیا بھر کے ظلم برداشت کرنے کے باوجود کس طرح علم پروری و معارف پروری کا فریضہ سرانجام دیا۔ دارالعلوم دیوبند اور اس نوع کے مدارس نے جس طرح مسلمانوں کے علمی ورثہ کو سنبھالا اور اسکی نگہداشت کی اور اس طرح کہ کوئی حکومت ان کی پشت پر نہ تھی بلکہ بعض متوسط اور غریب مسلمان ہی ان کے مال معاون تھے، ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔

لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب ایک عرصہ سے مسلمان قوم کے علمی طور پر بھی زوال کا رونا شروع ہو چکا ہے اور خاص طور پر ہمارے یہاں سربراہ مملکت سے لے کر عمائدین سلطنت تک، اساتذہ سے لیکر طلبہ تک اور والدین سے لے کر ایک عام فرد تک سب ہی اس قسم کی تشویش کا شکار ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے یہاں نئی نئی درسگاہوں کا جال بچھ گیا ہے، نہایت درجہ مستحکم اور مضبوط عمارات طول طویل رقبہ تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن نتائج کی تصویر اچھی خاصی المناک ہے، قومی اخبارات کے کالم آئے

وہ ایسے مضامین شائع کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا تعلیمی سانچہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے ۔ ہم نے مختلف اجتماعاتِ علمی میں خود اساتذہ کی زبان سے ایسی باتیں سنیں جو ایک باوقار قوم کے کردار کے قطعاً منافی ہیں ـــــ اصل یہ ہے کہ آزادی سے محرومی کے طویل عرصہ میں غیر ملکی حکمرانوں نے جس طرح کا تعلیمی نظام مرتب کیا اس نے سرکاری مشینری کے لئے اچھے کل پرزے تو تیار کئے ایسے افراد نہیں جو "ملت کے مقدر کا ستارہ" ہوتے ہیں ، ملک کے حالات کی زبوں حالی اس وقت پیش نظر ہے نہ اس پر گفتگو کا یہ موقعہ ہے لیکن اتنی بات کہے بغیر چارہ نہیں کہ ہماری حیاتِ اجتماعی کا نظام جو درہم برہم ہوا ہے اور اس میں بُری طرح دراڑیں پڑی ہیں تو اس کی ذمہ داری ۔ جی ہاں بنیادی ذمہ داری ہمارے نظامِ تعلیم پر ہی عائد ہوتی ہے ۔ ہم یہ کہتے نہیں تھکتے کہ مشرقی پاکستان میں ہندو اساتذہ نے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں کو مسخ کیا اور وہ ان راہوں پر چل نکلے جن کا انجام "بنگلہ دیش" کی شکل میں سامنے آیا لیکن یہ بھی تو واقعہ ہے کہ ۱۹۷۱ء کے بعد بھی تو ہم نے اس نظام کی اصلاح نہیں کی ۔ جب ہم مسلمان ہیں اور پاکستان کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ اسلام کے نام پر بنا اور قائم ہوا تو دیکھنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کی درسگاہوں میں کیا پڑھایا جا رہا ہے اور ان کا ماحول کیسا ہے ؟

ہمارے اہلِ دانش و فکر تسلیم کریں گے کہ ہماری درسگاہوں کا ماحول اس معیارِ مطلوبہ پر پورا نہیں اترتا جس کا ہم سے ہمارا دین تقاضا کرتا ہے اس لئے آنے والی سطور میں درسگاہوں کے ماحول کو معیاری اسلامی کردار میں ڈھالنے کے لئے گفتگو کی جا رہی ہے تاکہ ہم اس پریشان کن ماحول سے نکل سکیں اور ایک زندہ باوقار قوم کے طور پر ابھر سکیں ۔

اہلِ فکر اس حقیقت کو تسلیم کریں گے کہ کوئی بھی کام ہو اس میں کامیابی کے لئے تین باتیں بنیادی طور پر ضروری ہیں ، اگر وہ تین باتیں نہ ہوں اور ان کا اہتمام نہ کیا جائے تو نتائج کبھی بھی بہتر شکل میں سامنے نہ آئیں گے اور ساری محنت اکارت و رائیگاں جائے گی ۔

وہ تین امور جو صحیح نتائج کے حصول کے لئے کلید کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں سب سے پہلا امر تو "تعیینِ مقصد" ہے مقصد کا تعین نہ ہو گا تو انسان کا پہلا قدم ہی غلط رُخ

پر جا پڑے گا، دوسری چیز اس مقصد کے حصول کے لئے صحیح راستے کا انتخاب ہے اور تیسری چیز اس کے لئے انتھک کام، محنت اور مسلسل جدوجہد ہے اتنی جدوجہد کہ آدمی کو اس راہ کا مجنون کہا جانے لگے اور وہ بلاخوف لومۃ لائم اپنے جملہ وسائل اس کے لئے خرچ کر ڈالے۔

جب یہ بات طے ہے کہ تعین مقصد کے بغیر کامیابی موہوم ہوتی ہے اور صحیح راستے کا انتخاب کئے بغیر آدمی بھٹک کر رہ جاتا ہے اور کما حقہ محنت کے بغیر بھی بات نہیں بنتی تو علم و تعلیم جیسی اہم حقیقت جس پر ایک مسلمان کی آخرت ہی نہیں، اسکی دُنیا کی بھی فلاح کا دار و مدار ہے، اس میں ان تین چیزوں کا اہتمام کس قدر ضروری ہوگا؟ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر معاملہ میں مقصد کا تعین ضروری ہے تو اسکی دلیل خود قرآن مجید سے سامنے آتی ہے مثلاً انسانی تخلیق کا معاملہ ہے تو دیکھنا ہوگا کہ انسان کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ کیا اس کی تخلیق محض ایک عبث کام ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں، اللہ تعالیٰ نے تو کوئی بھی چیز عبث پیدا نہیں کی (آل عمران)، پھر انسان جسے قرآن مجید میں اشرف المخلوقات (بنی اسرائیل ۷۰) بتایا گیا وہ کیونکر بے کار پیدا ہو سکتا ہے؟ اسکی تخلیق کا مقصد اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات) فرمایا گیا، اور اسی طرف ابتدائی سورۃ ام الکتاب "الفاتحہ" میں بھی اشارہ ہے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ"، یہ مقصد کیسے حاصل ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ہندو ہو کہ پارسی، یہودی ہو کہ عیسائی سب کی تگ و دو اسی غرض سے ہے آخر وہ جو گرجے، مندر اور اپنی اپنی عبادت گاہوں میں جاتے ہیں تو جھاڑ جھونکنے کو نہیں ان کے سامنے بھی یہی مقصد ہے لیکن وہ راستہ کے انتخاب میں بھٹک گئے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں اسی طرف اشارہ ہے اور صحیح راستے کے انتخاب کی اہمیت پر اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے استدلال کیا جاتا ہے پھر معاملہ رہ جاتا ہے مسلسل لگن اور محنت کا تو اس کے لئے سورۂ عنکبوت کی آیت ۶۹ ملاحظہ فرمالیں جس میں راستہ ملنے کی نوید انہیں سنائی گئی جو "جہدِ مسلسل" سے کام لیتے ہیں۔

اس جملہ معترضہ کے بعد "تعلیم" کے متعلق سوچیں کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر تو مقصد معلومات میں اضافہ ہے، کثرت مطالعہ ہے، ڈھیروں کتابیں لکھنا اور پڑھنا ہیں

تو کوئی بھی عقل مند آدمی اسے "مقصدِ صحیح" کا نام نہیں دے سکتا بلکہ ایسے لوگوں کیلئے
چہار پائے برو کتابے چند کی کہاوت و ضرب المثل مشہور ہے جو فی الحقیقت ترجمہ ہے
سورۂ جمعہ کی آیت کا جس میں علماءِ یہود کا تذکرہ ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن نے "علماءِ یہود"
کا ذکر محض انہیں لتاڑنے کو نہیں کیا بلکہ "ایک کردار" کے طور پر ان کا ذکر ہوا، اب جو
بھی اس کردار کا حامل ہوگا، دعویٰ کی حد تک وہ کیسا ہی ہو، اس پر بھی یہی ضرب المثل
صادق آئے گی ہمارے خیال میں سورۃ فاطر کی آیت جس میں یہ ذکر ہوا کہ "اللہ تعالیٰ
سے ڈرنے کا حق اہل علم ہی ادا کرتے ہیں" اس سے مقصدِ علم و تعلیم کی آسانی سے
وضاحت ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ "انسان اخلاق و کردار کے اعتبار سے ایسا ہو جائے
کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی اس کی طبیعت ثانیہ بن جائے، اس کے
"اندر کا انسان" اور اسکے رُوح و قلب اس طرح نکھر اور سنور جائیں کہ اس کے لئے آن
سے فرشتے وضو کرتے نظر آئیں وہ بن سنور کر اور علم سے آراستہ ہو کر واقعی خلافتِ
ارضی کا مستحق ہو جائے — آپ تخلیقِ آدم میں مضمر حکمت کو معلوم کرنے کی غرض سے
فرشتوں کے سوال اور اس پر اللہ تعالیٰ کے عملی جواب کہ آدم کو علم سے آراستہ کر دیا۔
— پر غور کریں تو ہمارے اس دعویٰ کی آپ کو تصدیق کرنا پڑے گی اور اعتراف کرنا پڑیگا
کہ "انسان کی انسانیت" کا نکھارنا ہی دراصل علم کا مقصدِ صحیح ہے۔

لیکن ہم ذرا اپنی حیاتِ اجتماعی کا جائزہ لیں اور سوچیں کہ ہم نے "دینی درسگاہوں
سے لیکر دنیوی درسگاہوں تک" (اس دوہرے پن پر بھی کسی وقت گفتگو ہوگی) کا
جو جال پھیلا رکھا ہے، اس میں کتنے لوگ ہیں جو اس کاوش کے سلسلہ میں "صحیح
مقصد" سے واقف و آگاہ ہیں، معدودے چند افراد کو چھوڑ کر اس ساری علم پروری
و معارف پروری اور پڑھنے پڑھانے کے شغل میں مشغول لوگ یہ بات سامنے رکھتے
ہیں کہ اس محدود زندگی میں ہمیں خوب خوب آسائشیں نصیب ہو جائے اچھی ملازمت
مل جائے بڑا منصب نصیب ہو جائے گویا آزادی کے بعد بھی ہم شعوری یا غیر شعوری
طور پر اس گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں جس کا اہتمام غیر ملکی آقاؤں نے اپنی مصلحتوں
کے تحت کیا تھا — اہل علم و دانش "لارڈ میکالے" کے نام سے یقیناً واقف ہونگے
جس نے ۱۸۳۵ء میں ایک جدید تعلیمی پالیسی کا نقشہ مرتب کیا تھا اور اس کی غرض

یہ بتلانا تھی کہ ہمیں اپنی مشینری کے لئے کل پرزوں کی ضرورت ہے اور "تعلیمی انڈسٹری" میں ہم نے انہیں ہی ڈھالنا ہے۔ اس نے کہا تھا اور اپنے ہم وطنوں کو یہ باور کرایا تھا کہ تم دیکھنا اس انڈسٹری سے جو ڈھل کر نکلے گا اس کا نام مسلمان ہندو جیسا ہو تو ہو اس کے ذہن و فکر کا معاملہ ہم جیسا ہوگا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ لارڈ میکالے "تعلیمی پالیسی" وضع کی اس کا یہ مقصد بتلایا اور پھر یہ بھی افسوسناک حقیقت ہے کہ بالعموم ایسا ہی ہوا۔ حتیٰ کہ آج آزادی کے ۳۷ برس بعد بھی کچھ ہو رہا ہے ورنہ "نظریہ پاکستان" کا ہنگامہ بھی ہو "اسلامائزیشن" کا شور بھی ہو اور پھر بھی رشوت سفارش، جاہ طلبی، خود غرضی جیسے امراض ہوں — سمجھ میں آنے والی بات نہیں، معلوم ہوا کہ ہم نے ابھی تک "تعلیم" کو انڈسٹری کا درجہ دے رکھا ہے اسے "مقدس فرض" کا درجہ نہیں دیا۔ اگر اسے مقدس فرض کا درجہ دیا ہوتا تو آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی، ہمیں اپنے غریب، ان پڑھ اور سادہ لوح عوام سے کیا گلہ ہمارا سیاست دان روایتی عالم دین، مولوی، اہل صنعت و تجارت، اہل نظم و عدالت وہ تو "پڑھا لکھا" شمار ہوتا ہے لیکن للہ کوئی اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر ہمیں بتائے کہ ان کا طرز عمل، ان کا اجتماعی کردار، اعلیٰ انسانی اور اسلامی روایات کے مطابق ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو سمجھ لیں کہ ہم تعلیم کے میدان میں بھی ابھی تک اپنا قبلہ درست نہیں کر پائے۔

اس مرحلہ پر اس غلط انداز فکر کا ذکر کرنا بے حد ضروری ہے جس کا ہم سبھی شکار ہیں، اور وہ یہ کہ ہمارے حیات اجتماعی کی اصلاح وغیرہ کے عنوان سے آئے دن جو شور اٹھتا ہے تو اس میں ہمارا حال اس "کم عقل معمار" کا ہو کر رہ جاتا ہے جس نے عمارت کی بنیاد تو ٹیڑھی میڑھی بنائی لیکن اوپر پہنچ کر وہ مینا کاری اور رنگ و روغن کی فکر میں دبلا ہو کر رہ جاتا ہے، گویا اسے ٹیڑھے تنے کی فکر نہیں اور تمام تر توجہ شاخوں پر دے رکھی ہے اصلاح کا شور اٹھا ایک عدد نیا کمیشن، ادارہ اور بوڈ معرض وجود میں آگیا، پہلے سے قوم کی تقدیر سے کھیلنے والے چند دانشور" اس کے ممبر بن گئے، ان کے بھتے میں اضافہ ہو گیا یا "تبوک" کے طور پر چند ایسے بوڑھے شامل محفل کر لئے گئے جن کے قویٰ جواب دے چکے ہوتے

اس پر لاکھوں کا سرمایہ لٹ گیا اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ۔

اسکی مثالوں پہ آئیں تو ان کا سلسلہ زلف یار کی طرح دراز ہوجائیگا۔ اس لئے تفصیل سے قطع نظر صرف ایک زبان ہی کا مسئلہ لیں جس کا زندہ قوموں کے یہاں بڑا اہتمام ہوتا ہے ۔انگریز کی زبان بدل پالیسی کو سامنے رکھیں اور سوچیں کہ وہ کس طرح ہمارے ادبار سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا اور پھر اپنی حالت زار کو دیکھیں کہ روز نئے نئے ادارے قائم کرنے کے باوصف "زبان اُردو" کا کیا حال ہے ؟ وہ آج تک ہمارے معاشرہ میں اپنا خاطر خواہ مقام کیوں حاصل نہیں کر سکی - یہ انداز فکر کی غلطی کا ہی شاخسانہ ہے کیونکہ جس انداز سے ہم نئے بورڈ اور ادارے ترتیب دیتے ہیں ان کا لامحالہ یہی نتیجہ نکلنا ہوتا ہے -

یا پھر یہ دیکھیں کہ "اسلامائزیشن" کا عمل ماشاءاللہ خوب چل رہا ہے ۔ لیکن نتیجہ کوئی سامنے نہیں آرہا کیوں ؟ ۔ ہم نے عرض کیا اصل ضرورت "مقصد کے تعین" کی ہے انگریز بہادر نے اسلام جیسے مکمل نظام حیات کو محض ہماری نجی زندگی کا عمل بتلایا - لارڈ میکالے نے جو کھیپ تیار کی اس نے اسکی ہاں میں ہاں ملائی اور جس نے یہ کہا کہ اس سے پوری زندگی میں استفادہ کرو اسے احمق دقیانوس اور نہ معلوم کیا کیا کہا گیا - حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ ہر بچہ کی تعلیم کی جب ابتدا ہو تو اسطرح کہ وہ ان بنیادی حقائق سے آگاہ ہو جائے جو ایک مسلمان کی ضرورت ہے - اگر مساجد میں مکتب سکیم کے تحت ہر بچہ کی پرائمری سطح تک تعلیم لازم ہو جائے اور اساتذہ ایسے ہوں جو اسلامی اخلاق و کردار کا نمونہ ہوں تو اس کے بعد کوئی فلسفہ میں ایم - اے کرجائے یا ریاضی میں ، یا انگلش لٹریچر میں اس کا کچھ نہ بگڑے گا ، لیکن جب پرائمری تعلیم الف انار با بکری سے شروع ہو اور اس معصوم عمر میں حسن تربیت کے بجائے بوجھل بستہ طالب علم کا مقدر بن جائے اور بعض شکلوں میں اسے ملحد ، دھریہ اور عیسائی اساتذہ سے واسطہ پڑے تو وہ ایم اے فلسفہ ہونے سے قبل ہی اسلام سے اپنا تعلق عقیدت توڑ چکا ہوگا -

افلاطون سے ڈیکارٹ تک کا دور ہمارے یہاں "تاریک دور" شمار ہوتا ہے اس خرابی کا ازالہ آج تک نہیں کیا گیا - یہ دور تاریک ہوگا تو یورپ کے لئے ہوگا۔

ورنہ ہمارے ارباب فکر ودانش تو اس وقت آدھی دنیا کو علم سے روشن کر چکے تھے لیکن جس بچہ کی تعلیم الف انار سے شروع ہوتی ہے ۔ اس کو آخری لمحہ میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ آج فلسفہ و سائنس کے سبب جو روشنی نظر آرہی ہے وہ یورپ کا صدقہ ہے، یورپ کے دانشور نہ ہوتے تو ہم اندھیرے میں ہوتے، آخر ہمارے نصاب میں مسلم سائنس دانوں، فلاسفہ اور مناطقہ کی کارگزاریاں کیوں نہیں پڑھائی جاتیں اور کیوں ان کے اندر یہ لگن نہیں پیدا کی جاتی کہ وہ اپنے جلیل المرتبت اسلاف کی روحوں کو اس طرح خوش کریں کہ ان کی مضبوط بنیادوں پر قلعہ نما محلات کھڑے کریں، انتہا یہ ہے کہ دینی مدارس تک میں اس کا اہتمام نہیں نصف نصاب منطق و فلسفہ کی نذر ہو جانے کے باوجود "فضلاء و فارغین" کو اپنے روشن ماضی کا پتہ نہیں ہوتا اور جب روشن ماضی کا ہی پتہ نہیں تو سنہری مستقبل کی کون فکر کرے گا ؟

سائنس کا معاملہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو سب ہی تسلیم کر رہے ہیں کہ اس کی موجودہ ترقی مرہون منت ہے ان تحقیقات کی جنکی بنیاد مشاہدہ و تجربہ پر ہے نہ کہ ظن و قیاس پر، لیکن ستم یہ ہے کہ موجودہ درسگاہوں میں مسلم طلبہ کی اس طرح برینفنگ کی جاتی ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بیٹھ جائے کہ بس جی مغربی سائنس دانوں نے یہ سارے مرحلے سر کئے ہیں حالانکہ خالد بن یزید سے لے کر جابر بن حیان تک مسلم سائنس دانوں نے ہی اس طریق واستدلال کا اہتمام کیا اور انہی کے اصول کے پیش نظر آج یہ حقائق کھل رہے ہیں علم معاش کو دیکھیں تو اشتراکیت اور کیپٹلزم ہی تک ہماری معلومات محدود رہتی ہیں اور ہمارے ذہنوں میں یہ بات پیوست ہو جاتی ہے کہ بس نظام تو یہی دونوں ہیں، اسلام کی بات آتی ہے تو جھٹ سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اجی چھوڑیں اسلام نماز روزہ سکھلانے آیا ہے قوم کے معاشی مسائل حل کرنے تھوڑا آیا ہے، ظاہر ہے کہ اس فکر کے پیچھے وہ نظریہ کام کر رہا ہے جس میں اسلام کو انسانی زندگی کے پرائیویٹ معاملات کا مذہب ثابت کرکے اسے حیات اجتماعی سے الگ رکھنے کی سازش کی گئی ہے سیاسیات میں کتنے مسلم مفکرین ہیں جن کی کاوشوں سے طلبہ کو آگاہ کیا جاتا ہے یونان کی جمہوریتوں سے لیکر

جدید یورپ کی جمہوریت تک سبھی کچھ کا ہمارے نوجوانان عزیز کو علم ہوگا اور نہیں ہوگا تو مسلم مفکرین اور اہل سیاست کے نظریات کا، جنہوں نے خالی فلسفہ ہی نہیں گھڑا عمل کر کے عادلانہ معاشرہ قائم کیا اور تمیز بندہ و آقا کو یکسر ختم کر کے ایسی صورت پیدا کر دی کہ صرف مسجد کی صف میں ہی محمود و ایاز اکٹھے نظر نہیں آتے بلکہ دسترخوان سے لیکر عدالت تک میں یہی شکل ہوتی ہے عمرانیات کے موجد اول ابن خلدون تھے اس کا اعتراف یورپ بھی کرتا ہے اور پھر آئندہ چل کر شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریات نے ایک دنیا کو متاثر کیا لیکن اپنے نصاب میں تلاش کریں کہ ان لوگوں کا کہیں ذکر ہوا، ہوگا بھی تو اس طرح جیسے چوتھی صف کے یہ لوگ تھے اور پہلی صف کے وہ جو یورپ میں پیدا ہوئے۔

معاشیات ہی میں یہ انتہام تو ہوتا ہے کہ سود مفرد اور سود مرکب کے مسائل طلبہ کو معلوم ہو جائیں لیکن زکوٰۃ و عشر، میراث، خراج، فئے وغیرہ میں سے بعض چیزیں کے تو انہیں نام ہی معلوم نہیں ہوتے حالانکہ اسلامی معاشیات میں مدات آمدن تفصیل سے سامنے آئیں تو یہی طلبہ آئندہ چل کر غیر فطری نظام کے خلاف سرگرم عمل ہو جائیں لیکن چونکہ ہمیں، اسلامی بینکاری کے باوجود ظالمانہ ٹیکسز تمام رکھنے ہیں اسلئے ہم ایسی باتوں کی طرف نہیں آتے جن سے طلبہ کے ذہنوں میں وسعت پیدا ہو۔ علم جغرافیہ میں ہم شہروں اور ملک کی نہروں اور دریاؤں، ریلوے لائنوں اور کچی پکی سڑکوں کا تو ذکر کر دیں گے لیکن اس علم کے ایک اہم حصہ کے طور پر مسلم طلبہ کو نماز کے اوقات، سمت قبلہ وغیرہ معلوم کرنے کے طریق نہیں بتلائیں گے۔ مبادا اس عمر میں انہیں ان چیزوں کی اہمیت کا احساس ہو جائے اور ان کا دل مسلمان ہو جائے۔

ہم نے کوتاہیوں کے باب میں مثالوں سے بچنے کے باوجود کئی مثالیں دیدیں اور دے کیا دیں بے ساختہ نوک قلم پر آگئیں — حالانکہ اس وقت ایسا کرنے کا خیال نہ تھا اصل جو کہنا تھا وہ اصلاحی تدابیر تھیں یا تجاویز، جن کا تعلق نصاب، اساتذہ، طلبہ اور درسگاہوں سے ہے، شاید کسی سلیم الطبع اور نیک فطرت کے قلب و نظر کو اس سے کچھ روشنی حاصل ہو جائے اور کوئی اصلاح کے عمل کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔

نصاب، اس ضمن میں سب سے پہلے سامنے آتا ہے، ضروری ہے کہ نصاب

اس طرح وضع کیا جائے جس کے نتیجہ میں مقصد تعلیم مزید ابھرا اور نکھر کر سامنے آئے اور علم الیقین سے بڑھ کر طلبہ کو یقین ہو جائے کہ اس سے مراد محض حصول زر، ملازمت اور معاش نہیں بلکہ انسان کی ذات کی تکمیل ہے۔ نصاب ہلکا پھلکا ہو جس سے استعداد فن پیدا ہو نہ کہ بوجھل اور یہ بات بے حد اہم ہے کہ ایم اے اسلامیات ہی کافی نہیں بلکہ ایسا ایک سازش کے تحت ہوا ہے اس سے کوئی فائدہ نہیں، ہر سبجیکٹ اور مضمون کا نصاب اس طرح مرتب ہو کہ اس کا فاضل مخصوص مضمون میں طاق ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامیات کا بھی ماہر ہو اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ نصاب کا ہر جزو اسلامی تعلیمات اور مفکرین اسلام کے نظریات کا حامل ہو۔ یہ اسلئے بھی ضروری ہے کہ مصنف و مولف کی طبیعت، اس کے رجحانات و افکار کا شعوری نہ سہی غیر شعوری طور پر طلبہ پر اثر ہوتا ہے، فلہذا مسلم مفکرین کی آراء، ان کے مشاہدات و تجربات اور ان کی تحریرات کو اولیت دی جائے اور "دشمن کی شہادت" کے طور پر غیر مسلم مفکرین کی آراء تائیداً پیش ہوں تاکہ ایک تو اس طرح معصوم ذہن اسلامی روایات اور مسلم مفکرین کی معارف پروری سے واقف ہو سکے۔ تو دوسری طرف اسے اپنے اور بیگانے کی تمیز بھی رہے دشمن کے معاملہ میں مروت و وسعت نظری اپنی جگہ لیکن اسے دشمن سمجھنا تو ضروری ہے — اس موقعہ پر اس بات کا اظہار کر دوں کہ شعبۂ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے سربراہ اور بانی صدر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور خلیفہ عبدالحکیم اپنی تمام تر "وسعت ظرفی" کے باوصف جب کسی مستشرق اور پادری سے گفتگو کرتے حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم انسان، فولادی بن کر رہ جاتا اور یہ غیرت ملی کا تقاضا ہے۔

نصاب کی اصلاح کے لئے لازم ہے کہ ایک ایسا بورڈ بنایا جائے جس میں خشیت الٰہی سے معمور قدیم و جدید علماء کی ایک کھیپ ہو، وہ لوگ اور حضرات جو ہمیشہ سے کمیٹیوں اور بورڈوں کے لئے زندہ رہتے ہیں، یہ بورڈ ان سے خالی ہو، پھر یہ بورڈ متانت اور سنجیدگی سے پورے نصاب کا جائزہ لے اور قومی و ملی روایات کو اس میں اس طرح سمو دے کہ پھر کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہ رہے۔

پھر نصاب پڑھانے کا انداز ایسا ہو کہ طلبہ خود بخود اسلامی ذہن کے مالک بنتے جائیں۔

اور ان کی سیرت و کردار اس سانچے میں ڈھلتی جائے جو ہماری ضرورت ہے اگر کہیں یہ جملہ آتا ہے کہ "آگ میں جلانے کی صلاحیت ہے" تو اسے یوں ادا کریں کہ "اللہ تعالیٰ نے آگ میں جلانے کی صلاحیت رکھی ہے" تو اندازہ کریں کہ کس طرح ربّ العزت کا انداز حاکمیت ذہنوں میں پیوست ہوگا اور اس کے احکم الحاکمین کا شعور اجاگر ہوگا۔ گویا ہمیں اسلامیات پڑھانے کے لئے ہی "صحیح مسلمان" اور غیرت مند دل و درد رکھنے والے اساتذہ کی ضرورت نہیں بلکہ ایسے مسلمان ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، فلسفی اور اہل فن مطلوب ہیں جو ہر مقام پر اپنی صلاحیتوں کو کسی کا عطیہ قرار دیں۔ پرائمری تک کی تعلیم کے لئے مساجد کی سطح پر مکتب اسکیم جاری کی جائے۔ جس میں کم از کم ناظرہ قرآن مجید معہ چند سورتوں کے حفظ کے۔ پوری نماز، چھ کلمے اور بنیادی عقائد محفوظ ہو جائیں، ساتھ ہی ساتھ بچہ مروجہ پرائمری کے معیار پر پورا اتر جائے۔ یہ پانچ سال لازمی تعلیم ہو تاکہ کوئی بچہ بالکل جاہل نہ رہے اگر یہ جعلی نصاب تعلیم کے بجائے علمی ذوق پیدا کرنے والا پرائمری نصاب بنا لیا جائے تو یقین ہے کہ آئندہ چل کر یہ پرائمری بچہ مڈل کے بچوں سے زیادہ باصلاحیت ہوگا۔ اس کے بعد میٹرک تک اسلامیات میں قرآن و سنت کے مخصوص حصے، سیرت رسول، سیرت صحابہ اور آثار سلف کا گہرا ادراک طلبہ کو نصیب ہو جانا چاہیئے۔ طلبہ میں اپنے دین کا صحیح شعور پیدا کرنے کی غرض سے عربی زبان کو چھٹی کلاس سے لازمی قرار دیا جائے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ مشہور عصری و دینی درسگاہ ندوۃ العلماء کا ابتدائی عربی نصاب اس صلاحیت کا مالک ہے کہ اسے محنت سے پڑھایا جائے تو بچوں میں قرآن فہمی کا ذوق خوب خوب پیدا ہو جائے گا اور یہ بات چھٹی کلاس سے دسویں تک پانچ سال میں مشکل نہیں۔ اس ذریعہ سے پوری نوجوان نسل قرآن حکیم کے فہم کو جذب کر کے ان گنت برائیوں بالخصوص الحاد، دھریت اور فرقہ واریت سے محفوظ ہو جائے گی پھر کوئی پیشہ ور واعظ اور فلسفی اسے بہکا نہ سکے گا۔

آرٹس، سائنس اور کامرس وغیرہ کے مضامین کو جس طرح اب اہمیت حاصل ہے اور ان کے لئے باقاعدہ ہائر ایجوکیشن کا نظم ہے اسی طرح اسلامیات کے لیے الگ سے کلیہ ہو اور خالص علمی مضامین میں طلبہ کو ترغیب دیکر لایا جائے اور ان کی حوصلہ

فراہمی کی جائے ۔ یہ بچے آئندہ چل کر زیادہ احسن طریق سے خدمت دین کو سکیں گے ۔

نصاب کے بعد دوسرا اہم عنصر اساتذہ کا ہے جسے تعلیمی میدان میں بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ کوئی ذی شعور انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اچھے سے اچھے نظام سے صحیح ثمرات تب ہی سامنے آئیں گے جب اس کے چلانے والے اہل اور موزوں اشخاص ہوں ۔ ہم تعلیم کے معاملہ میں شدت احساس کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن ہم نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی کہ اساتذہ کیسے ہونے چاہئیں ، ہمارے ذاتی علم میں ہے کہ بعض مواقع پر اساتذہ کی آسامیاں پُر کرنے کے لئے بھی " رشوت و سفارش " کو کام میں لایا جاتا ہے ۔ یہ بات ظاہر ہے کہ زہر قاتل ہے جو شخص رشوت کی سیڑھی عبور کر کے " استاذ " کے مقام پر پہنچے گا وہ ایک خاص احساس کا شکار رہ کر ساری عمر جلب منفعت ہی کی فکر میں رہے گا جس کی ایک بدترین شکل ہمارے یہاں کا ٹیوشن نظام ہے جو بعض بعض سکولوں میں لازم ہو کر رہ گیا ہے کہ اگر " ماسٹر جی " سے خارج وقت میں ٹیوشن نہ پڑھو تو بُرا انجام بھگتو ۔

روڈ بورڈ والے انسانی جسموں اور جانوں کی حفاظت کے نکتہ نظر سے اچھے ، باصلاحیت اور سمجھدار ڈرائیور کو نوکر رکھتے ہیں تو روح کی بالیدگی کا مسئلہ ہے ، اگر تعلیم ناقص ہوئی تو اس سے روح انسانی قتل ہوگی جو جسمانی قتل سے بدتر جرم ہے ۔

سب سے اوّلین ضرورت یہ ہے کہ اس جذبہ کو سامنے رکھا جائے جو علم کا مقصد ہے ، اساتذہ قلباً و ذہناً مسلمان ہوں ، ان کے عقائد و نظریات غیر مبدل ہوں ، دنیا کا لالچ انہیں خرید نہ سکے ۔ انہیں ملکی روایات و نظریہ سے گہری وابستگی اور اپنے بڑھ کر ان میں مروت و شفقت ہو ۔

مکتب اسکیم کے اساتذہ نوخیز اور نوجوان نہ ہوں بلکہ کم از کم ادھیڑ عمر کے حضرات جن میں لکھنے پڑھنے کا غیر معمولی ملکہ اور صلاحیت ہو اور جو تعلیم کے ساتھ تربیت کے اسلامی اور مشرقی اصولوں کو حرز جاں سمجھتے ہوں ۔ لیکن انہیں معاشی طور پر اس طرح مطمئن رکھا جائے کہ یہ سب جھمیلوں سے الگ ہو کر بس اسی کام کے ہو کر رہ جائیں ۔ ہائی کلاسز اور اس سے اوپر کی کلاسز کے اساتذہ جو اس وقت تعلیمی کام کر رہے ہیں ان سے درخواست کی جائے کہ وہ نظریاتی اور اخلاقی طور پر اپنے آپکو مطلوبہ معیار

کے مطابق بنائیں، ضرورت محسوس ہو تو ان کے لئے "تربیتی کورسز" کا اہتمام کیا جائے کہ فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ (یوسف ٧٦) آخر ہر محکمہ کے اعلیٰ افسران گاہ بگاہ مختلف کورسز میں شریک ہوتے ہیں اساتذہ ایسی زحمت کرلیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ ایک اعلیٰ مقصد سامنے ہو۔ اگر کوئی اساتذہ مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اتر سکتا اور اپنے آپ کو اس سے ہم آہنگ نہیں کر سکتا تو اسے رضاکارانہ طور پر مستعفی ہو کر کوئی اور لائن اختیار کر لینی چاہیئے۔ اساتذہ درسگاہ اور درسگاہ سے باہر اتنی محتاط اور پاکیزہ زندگی گذاریں کہ معاشرہ ان کی راہ میں آنکھیں بچھائے، آخر کو جج حضرات کو دیکھیں کوٹ کے اندر اور باہر انکا کیا حال ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وقار اور متانت انہی کا حصہ ہے، لیکن ہمارے نزدیک استاذ جج سے زیادہ مقدس ہے، ایک جج بھی اُستاذ ہی کی حسن تعلیم و تربیت سے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، اس لئے اس کا علم ٹھوس، اس کے اخلاق بلند، اس کا جذبہ جواں اور اس کے عقائد و نظریات اسلامی روایات کے عین مطابق ہونے ضروری ہیں۔

اس سلسلہ کا تیسرا عنصر طلبہ ہیں جنہیں حقیقی عنصر کہنا چاہیئے۔

اس عنصر کا معاملہ ایسا ہے کہ

ع یہ ننھی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہیں

اپنی عمر، صلاحیت اور استعداد کے اعتبار سے یہ نفع و نقصان اور خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتے اس لئے ان پر توجہ کی شدید ضرورت ہے، توجہ میں صحیح نصاب تعلیم اچھے اساتذہ، بہتر خارجی ماحول اور تعزیرات سبھی کی ضرورت ہے۔

وہ معصوم ذہن ہیں آپ جو انہیں پڑھائیں گے وہی پڑھکر اس کا اثر لیں گے۔ اس لئے ان کے لئے صحیح نصاب بنیادی شرط ہے اور ان کے لئے سب سے بہتر درسگاہ مسجد ہے جس کا پاکیزہ، ستھرا اور صاف ماحول ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کا ضامن ہوگا۔ اسی لئے ہم نے پرائمری تعلیم کو مسجد میں قائم مکتب اسکیم سے وابستہ کرنے کی درخواست کی تاکہ بچہ پروان چڑھے تو اللہ تعالیٰ کے گھر میں۔

اساتذہ اس کے قلب پر اپنی عظمت کے نقوش ثبت کرنے ذمہ دار ہیں۔ اسلئے اساتذہ کے انتخاب میں اس بات کو مدنظر رکھنا لازم ہے کہ وہ طلبہ پر کس طرح اور

کتنے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

خارجی ماحول کی بہتری انکے لئے بے حد ضروری ہے کیونکہ ۲۰۴ گھنٹہ اگر پاکیزہ علمی فضا میں رہنے کے بعد باقی ۱۶۸ گھنٹے وہ ایسے ماحول میں رہے، جس میں جنسی ناول، فحش لٹریچر، اذہان کو مسموم کرنے والے ریڈیو۔ٹی وی پروگرام ہوں گے تو ظاہر ہے کہ اس تخریب کا اثر زیادہ بڑھے گا۔

ضرورت اس کی ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ فی الحقیقت درسگاہ بن جائے، ہماری لائبریریاں ایسی ہوں جن میں علمی، اخلاقی ذخیرہ ہو، ہمارے ذرائع ابلاغ اور اخبارات ایسے ہوں جو مجسم استاذ کا کام دیں، ہمارا کاروباری حلقہ ایسا ہو کہ اگر کبھی طالب علم اس سے سودا لینے جائے تو وہ دیانت و امانت کا سبق سیکھ کر آئے، ہمارا بس ڈرائیور اور کنڈکٹر ایسا ہو کہ اس کی بس میں سوار بچہ اس سے شرافت بھلائی مقصد سے لگن اور سچی خدمت کا سبق سیکھ کر رخصت ہو، سب سے زیادہ ذمہ داری والدین پر ہے کہ وہ محض اس پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ جائیں کہ بچہ درسگاہ جاتا ہے اساتذہ سے پڑھتا ہے وہ خود اسکی نگرانی کریں۔ تعزیر کا معاملہ یہ ہے کہ بوقت ضرورت تادیب کے نقطۂ نظر سے اسکی گوشمالی سے گریز نہ کیا جائے دس سال کے بچے کی گوشمالی کر کے اسے مسجد میں لے آنے کا نبوی حکم آخر تعزیر ہی تو ہے، بچہ نے گالی دی ماں باپ نے ہنس کر ٹال دیا، اس نے گھر میں سے کوئی چیز چوری کر لی اس سے صرف نظر کر لیا یہی باتیں مستقبل میں اسکی ہلاکت کا سبب بنتی ہیں۔

ان کے عقائد و اخلاق کی اصلاح، عبادت کا شوق ان میں پیدا کرنے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کے احساس سے واقف کرنے کا شدید اہتمام لازم ہے کوئی چھوٹی بڑی درسگاہ مسجد سے خالی نہ ہو، اور کچھ نہ کچھ وقت کسی بہانے سے طلبہ کا اس معطر ماحول میں گذرے۔

ایک زیادتی اس نسل کے ساتھ مخلوط تعلیم کی ہے جس کا ازالہ جتنا جلد کر دیا جائے بہتر ہے ورنہ اس اختلاط کے نتیجہ میں جو تباہی آ رہی ہے اسکے طوفان کو روکنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی غیر نصابی سرگرمیاں از قسم جماعت سازی بیرونی جماعتوں سے وابستگی، ان کے مفاد کے لئے جد و جہد یہ سب باتیں زہر قاتل

(بقیہ ص ۸۰ پر)

محمد تقی امینی

(قسط ۱۴)

قرآنی علم و فہم کا درجۂ حکمت

قرآنی علم و فہم میں درجۂ حکمت تک رسائی کے لیے سماج کی طرح کائنات میں بھی فطری نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کی ضرورت ہے جس کا تعین کائنات سے متعلق قرآنی آیتوں سے ہوتا ہے۔

انسان کو کائناتی قوتوں کا علم دیا گیا

اوپر گذر چکا ہے کہ انسان میں نوری صفات کے ساتھ کائناتی خصوصیات موجود ہیں اور انسان کو امکانی صلاحیتوں کی مناسبت سے کائنات کی امکانی قوتوں کا علم دیا گیا ہے جس کی نشاندہی خلافتِ آدم کے واقعہ میں ابتداءً کر دی گئی تھی اور ان قوتوں کو استعمال کرنے کی ہدایت و تاکید بھی تھی

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ [1]

اور تمہارے لیے زمین میں ایک مدت معیّنہ تک ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے۔

" متاع " کا لفظ اپنے عمومی مفہوم میں وقت کے لحاظ سے کائناتی قوتوں سے مستفید ہونے کو جامع ہے۔

پھر حسبِ وعدہ ہدایتِ الٰہی آتی رہی اور انسان کو ان قوتوں کو کام میں لانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی طرف متوجہ کرتی رہی۔

وَكَذَٰلِكَ كُلَّ نَبِيٍّ اسْتَخْلَفَهُمْ فِي عِمَارَةِ الْأَرْضِ وَسِيَاسَةِ النَّاسِ وَتَكْمِيلِ نُفُوسِهِمْ وَتَنْفِيذِ أَمْرِهِ فِيهِمْ [2]

اسی طرح ہر نبی کو اللہ نے (زمین) کی آبادکاری، لوگوں کی سیاست ان کے نفوس کی تکمیل اور ان میں اپنا حکم نافذ کرنے میں خلیفہ بنایا۔

---

[1] بقرہ آیت ۳۶ [2] البیضاوی، البقرہ آیت ۳۶

کائنات کی نقاب کشائی

بلاشبہ آسمانی مدد و رہنمائی (ہدایتِ الٰہی) کا وظیفہ اصلاً انسان ہے۔ لیکن وہ انسان، جو کائنات کا قائد اور اس کی قوتوں کا پاسبان ہے اس لحاظ سے جو ہدایت بھی آئے گی وہ کائنات کی نقاب کشائی سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ ہدایتِ الٰہی ہر دور میں ایک طرف انسان کی نقاب کشائی کرتی رہی اور دوسری طرف کائنات کی بھی نقاب کشائی کرتی رہی۔ دونوں میں فرق یہ رہا کہ انسان کے خدوخال بھی نمایاں کرتی رہی جبکہ کائنات کی صرف نقاب کشائی پر اکتفا ہی کرتی رہی

انسان اور کائنات کے درمیان فرق کی وجہ

فرق کی وجہ غالباً یہ تھی کہ انسان کے خدوخال میں ہزار رمز اخفتیں اور رکاوٹیں تھیں۔ شیطان نے اُس کا چہرہ مسخ کر دینے کی قسم کھا رکھی تھی اور ہر ہر موڑ پر سنگِ گراں بن کر حائل تھا۔ اس بنا پر ہدایت الٰہی کو انسان کا اصلی خدوخال نمایاں کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ کائنات میں صورتِ حال ایسی نہ تھی اس کے خدوخال نمایاں کرنے کی خود انسان میں نہ بردست خواہش و طلب موجود تھی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ موجزن تھا۔ اور ہر اُٹھا ہُوا قدم آگے بڑھنے کا پیش خیمہ تھا۔

پھر انسان کی نوع بنوع ضرورتوں، اس کی بے پناہ صلاحیتوں اور کائنات کی بے پناہ امکانی قوتوں کی وجہ سے فطرت خود کانٹ چھانٹ کرتی اور خوب سے خوب تر کو نمایاں کرتی رہتی ہے۔ ایسی حالت میں ہدایت کو خدوخال میں خواہ مخواہ دخل دینے کی ضرورت نہ تھی کہ اس کے بغیر ہی ہدایت کا مقصد حاصل تھا۔

قرآن میں نقاب کشائی کا زیادہ اہتمام ہے

قرآن حکیم ہدایتِ الٰہی کا آخری اور مکمل ایڈیشن ہے۔ اس بناء پر اس میں کائنات کی نقاب کشائی کا زیادہ وسیع پیمانہ پر اہتمام ہے۔ چنانچہ نزولِ قرآن کے بعد ہی انسان نے کائنات کے مختلف گوشوں میں مختلف پہلوؤں سے غور و فکر کیا اور وقت کے دماغی رفتار کے لحاظ سے حکمت (مصالح و منافع کا تیز تر نظام) کے دفینے برآمد کیے جو بعد میں مختلف

علم وفن کی شکل اختیار کر کے ہمارے سامنے موجود ہیں جن کی کسی قدر تفصیل یہ ہے:

کائنات سے متعلق آیتیں

قرآن حکیم میں کائنات سے متعلق تقریباً سات سو پچاس آیتیں ہیں جن میں فکر و نظر کی اصلاح اور ذہنی جستجو کا رُخ متعین کرنے کے ساتھ مظاہرِ کائنات، حقائقِ موجودات، محاسنِ کائنات، مناظرِ قدرت، مظاہرِ فطرت اور تسخیرِ کائنات، کا ذکر ہے۔ اسی طرح مختلف آیتوں میں زمین، پہاڑ، دریا، نہریں، سبزی، پھل، کھیت، سورج، چاند، ستارے، بارش، آگ، دھواں وغیرہ کا ذکر ہے اور ان سب میں یتفکّرون، یذّکرون اور یعقلون کے ذریعہ غور و فکر کی دعوت ہے۔

اس غور و فکر کا عام فائدہ یہ ہے کہ اس سے اللہ کی ہستی و وحدانیت پر دلیل قائم ہوتی ہے۔ اللہ کی عظمت اور اس کی قدرت کی نشانی ظاہر ہوتی ہے اور دوسرا خاص فائدہ یہ ہے کہ غور و فکر سے اللہ کی وہ حکمت (مصالح و مقاصد) آشکارا ہوتی ہے، جو ابتدائے آفرینش سے کائنات میں ملحوظ ہے ——— اس حکمت کا ظہور ایک دم سے نہیں ہوتا بلکہ وقت کے دماغی رفتار کے لحاظ سے بتدریج مطلوب ہے۔ اسی طرح اس حکمت کا ظہور ہر شخص پر نہیں ہوتا بلکہ درجۂ حکمت پر فائز شخص کو ہوتا ہے۔ جس کی صلاحیتوں میں اللہ نے وہ خانہ ودیعت کیا ہے جو کائناتی حکمت کے لیے درکار ہے۔ یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ ان آیتوں سے صرف عام فائدہ حاصل کیا جائے اور خاص فائدہ کو نظر انداز کر دیا جائے۔

کائناتی حکمت کا خزانہ بے حد و حساب اور ایک ناپید اکنار سمندر ہے بس وقت کے لحاظ سے اپنی اپنی بساط کے مطابق حکیم اس سمندر میں غوطہ زنی کرتا اور گوہر آبدار نکال کر لاتا ہے۔ جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیوں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا۔ اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند

بِمِثْلِهٖ مَدَدًا [1] اور سمندر ملا دیں۔

دوسری جگہ ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ [2]

اور اگر زمین میں جو درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر سات مزید سمندروں کے ساتھ روشنائی بن جائیں جب بھی اللہ کی نشانیاں قلم بند نہیں ہو سکتی ہیں۔ بیشک اللہ ہی غالب و حکیم ہے۔

کلمٰت سے مراد اللہ تعالےٰ کی قدرت و حکمت کی وہ نشانیاں ہیں جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔

آیتوں سے حاصل شدہ استنباطی علم

کائناتی آیتوں میں غور و فکر کی دعوت و تاکید سے

قرآنِ حکیم نے وہ طریقۂ رسائی یا طریقۂ علم دیا کہ جس سے استدلال و استنباط کا دروازہ کھلا اور وہ علم وجود میں آیا جس کو استنباطی علم کہا جاتا ہے جس میں براہِ راست چیزوں کے مشاہدہ سے نہیں بلکہ ماورائے مشاہدہ سے علم حاصل کیا جاتا ہے۔ اس طرح علم کی دو قسمیں بنتی ہیں۔

(۱) وہ علم جو براہِ راست چیزوں کے مشاہدے سے حاصل کیا جاتا ہے۔

(۲) وہ علم جو ماورائے مشاہدہ اثرات (EFFECTS) دیکھ کر حاصل کیا جاتا ہے۔

اس دوسرے علم کی اہمیت پہلے کے مقابلہ میں کم نہیں ہے کہ اسی پر غور و ارتقاء کا مدار ہے۔ جدید دور میں نہ معلوم کتنی حقیقتیں ہیں جو اس علم کے ذریعہ دریافت ہوئی ہیں۔ مثلاً کشش، مقناطیسیت۔ جوہری طاقت وغیرہ۔ جو براہِ راست اگرچہ مشاہدہ میں نہیں آتی ہیں لیکن انسان جن چیزوں کا مشاہدہ و تجزیہ کرتا ہے، ان کے ذریعہ رسائی حاصل کی جاتی ہے۔

اس طریقۂ علم نے بے شمار ان غیبی حقیقتوں تک پہنچایا جو اگرچہ مشاہدہ

---

[1] کہف آیت ۱۰۹ [2] لقمان آیت ۲۷۔

میں نہیں آتی ہیں لیکن کائنات میں کارفرما ہیں۔ اسی طرح ان غیبی حقیقتوں تک ایمان کا دروازہ کھولا جو ماورائے کائنات ہیں اور انسان محض اس بنا پر انکار کرتا ہے کہ ان کو اس نے ابھی دیکھا نہیں ہے۔

استنباطی علم کی کرشمہ سازیاں

استنباطی علم کی کرشمہ سازیوں کا کچھ اندازہ اس وضاحت سے ہوتا ہے کہ جس زمین پر ہم آباد ہیں یہ ہمارے نظام شمسی کا صرف ایک سیارہ ہے، جو سورج کے مقابلہ میں مٹر کے ایک دانہ کے برابر کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ سورج تو سورج، سیارہ مشتری اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہماری جیسی ایک ہزار سے زیادہ زمینیں سما سکتی ہیں۔ پھر آسمان پر جو چھوٹے چھوٹے تارے دکھائی دیتے ہیں ان میں اکثر سورج کے برابر اور بہت سے خود سورج سے اتنے بڑے ہیں کہ ان میں دس ہزار سورج سما سکتے ہیں۔ تارے وہ کہلاتے ہیں جو خود بخود روشن ہیں یعنی جو اس وقت جلتی ہوئی گیس کی حالت میں پائے جاتے ہیں۔ باقی جو ٹھنڈے ہو چکے ہیں جیسے ہماری زمین اور مریخ وغیرہ وہ سیارے کہے جاتے ہیں۔ اس وقت تک کے معلوم و مشہور سیاروں کی تعداد نو ہے۔ ان میں سے بعض سیاروں کے ساتھ ان کے توابع یعنی چاند بھی پائے جاتے ہیں۔ زمین کے ساتھ ایک چاند ہے، مریخ کے ساتھ دو اور زحل کے ساتھ نو۔ سورج بھی درحقیقت ایک تارہ ہی ہے جو مختلف عناصر لوہے، المونیم، جست، نکل وغیرہ کے جلتے ہوئے بخارات یا گیسوں کا بہت بڑا کرہ ہے اس سے آنے والی روشنی زمین تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔ روشنی سے مراد فی ثانیہ (سیکنڈ) ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے۔

یہ صرف ایک عالم یا ہمارا عالم ہے اس کے علاوہ بکثرت ایسے عالم پائے جاتے ہیں جو ہمارے اس عالم سے بالکل باہر نہایت دور دراز فاصلوں پر واقع ہیں۔ ان ہزاروں ہزار عالموں میں ہر ایک اتنا ہی عظیم الشان ہے جتنا کہ یہ ہمارا عالم ہے۔ جدید فلکیات نے ہماری نظر کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ یہی نہیں کہ اس عالم یا کائنات سے متعلق ہمارا علم و تصور مسلسل وسیع ہوتا جا رہا ہے بلکہ خود پوری کائنات بجائے خود بھی روز بروز وسیع تر ہوتی یا پھیلتی جا رہی ہے۔ جن بعید ترین اجرام سماوی کو ہم موجودہ بڑی سے بڑی دوربین سے دیکھ سکتے ہیں وہ بھی اتنے بعید فاصلہ پر واقع ہیں۔ یہ ایک [illegible]

میل فی ثانیہ (سیکنڈ) کی رفتار سے حرکت کرنے والی روشنی کو ان اجرام سے ہم تک آنے میں ایک سو چالیس ملین (چودہ کروڑ) سال لگ جاتے ہیں۔ سب سے قریب چاند ہے وہ بھی دو لاکھ چالیس ہزار میل دُور ہے۔ سورج تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل دُور ہے۔ ہم سے قریب ترین ستارہ بھی اتنی دُور ہے کہ اس کی روشنی ہم تک آنے میں چار سال لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ روشنی ایک سکینڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سفر کرتی ہے۔ اجرام سماوی میں سب سے قریب ہمارے علم و مشاہدہ کے لیے نظام شمسی ہے اس کے بعد چند ہزار ملین روشنی کے سالوں تک علمائے فلکیات کا سائنسی مشاہدہ و مطالعہ کام دیتا ہے۔ پھر آگے روشنی اور ریڈیو کی لہریں اتنی کمزور ہو جاتی ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ اب آگے کیا ہے [1]

کرشمہ سازیاں حکمت پر مبنی ہیں

پھر یہ نظام شمسی اس قدر منظم و مربوط اور حکمت پر مبنی ہے، کہ اگر اس میں معمولی سی بھی تبدیلی ہوئی تو کائنات کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے۔ مثلاً زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہے۔ فرض کیجیے کہ اگر یہ رفتار ایک ہزار کے بجائے ایک سو میل فی گھنٹہ ہو جائے تو دن و رات دس گنا زیادہ لمبے ہو جائیں پھر زمین کی سبزیاں اور فصلیں مسلسل دھوپ میں جُھلس جائیں اور جو بچ رہیں، وہ لمبی رات میں پالے کی وجہ سے ختم ہو جائیں۔

سورج اپنے محور پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ سے دہک رہا ہے۔ یہ حرارت اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑ بھی اس کے سامنے جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائیں۔ لیکن وہ زمین سے اتنے مناسب فاصلے پر ہے کہ بس ضرورت سے زیادہ گرمی نہ دے سکے۔ بالفرض اگر سورج دُگنے فاصلہ پر ہو جائے تو زمین پر سردی کی وجہ سے سب لوگ جم کر برف ہو جائیں اور اگر آدھے فاصلہ پر سورج آجائے تو زمین پر اتنی حرارت پیدا ہو جائے کہ تمام پودے و جاندار جل بھُن کر خاک ہو جائیں۔

چاند ڈھائی لاکھ میل کے فاصلہ پر ہونے کے بجائے صرف پچاس ہزار میل دُور

---

[1] مولانا عبدالباری ندوی۔ مذہب و سائنس ص ۶۱ و ۶۱، ۷۱

ہوجائے تو سمندروں میں مدّوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوں کہ کرّۂ زمین دن میں دو مرتبہ پانی میں ڈوب جائے اور موجوں کے ٹکرانے سے بڑے بڑے پہاڑ ختم ہوجائیں۔

سورج اپنی غیر معمولی کشش سے زمین کو کھینچ رہا ہے۔ اور زمین ایک مرکز گریز قوت (CENTRIFUGAL FORCE) کے ذریعہ اس کی طرف کھنچ جانے سے رکی ہوئی ہے۔ بالفرض کسی دن زمین کی یہ قوت ختم ہو جائے تو وہ تقریباً چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے گی اور چند ہفتوں میں سورج کے اندر اس طرح جا گرے گی کہ جیسے کسی بہت بڑے الاؤ میں کوئی معمولی چیز گر جائے۔

کرّۂ ارض ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتا ہوا ایک طرف کو جھکا ہوا ہے (فضا میں سیدھا کھڑا نہیں ہے) یہ جھکاؤ موسم کے لیے ہے اور اس کے نتیجہ میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قابل بنتا ہے۔ اور اس سے مختلف قسم کے نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں۔ اگر یہ جھکاؤ نہ ہو تو سمندر سے اٹھے ہوئے بخارات سیدھے شمال یا جنوب کی جانب چلے جائیں اور ہمارے برِ اعظم برف سے ڈھک جائیں۔

کرشمہ سازیاں کئی دائروں میں محدود نہیں ہیں

استنباطی علم کی کرشمہ سازیاں

کسی ایک دائرہ میں محدود نہیں ہیں بلکہ کائنات کے ہر گوشہ اور ہر دائرہ میں موجود ہیں قرآن حکیم نے لفظ "آلاء" مختلف مواقع پر استعمال کیا ہے۔ اور شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر میں التذکیر بآلاء اللہ کا مستقل باب باندھا ہے جس کے معنیٰ عام طور پر نعمتوں کے کیے جاتے ہیں لیکن علامہ عبدالحمید فراہی نے اس لفظ کی جو تحقیق کی ہے اور ثبوت میں کلام عرب کے شعراء کے جو تائیدی شواہد پیش کیے ہیں، ان سے یہ لفظ زیادہ وسیع اور جامع قرار پاتا ہے۔ اور اس کے اصل معنی کرشموں کارناموں، عجائباتِ قدرت و آثارِ حکمت کے ہوتے ہیں نعمتوں کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:

الآلاء اجمعوا على ان معناه النعم ولكن القرآن واشعار العرب يأباه والظاهرات	لوگوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ آلاء کے معنی نعمتوں کے ہیں۔ لیکن قرآن اور کلام عرب سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے۔ ان سے

معناه الفعال العجیبۃ فارسیۃ کرشمہ" لما کان غالب فعاله تعالیٰ الرحمۃ ظنوا ان الالاء هی النعم [1]

جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے معنی عجیب کام کے ہیں جس کی فارسی کرشمہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے اکثر کام رحمت کے ہیں جس سے لوگوں نے سمجھا کہ آلاء کے معنی نعمت کے ہیں۔

پھر کائنات سے متعلق مختلف آیتوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں تخلیق کائنات۔ جمادات۔ نباتات۔ حیوانات وغیرہ۔ ہر ایک کا نہ صرف ذکر موجود ہے بلکہ ان میں غور وفکر کی دعوت بھی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طبعیات حیاتیات اور ارضیات وفلکیات وغیرہ کے علوم جن تک رسائی جدید دنیا کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے ان سب کی پود" ہدایتِ الٰہی کی لگائی ہوئی ہے۔

کرشمہ سازیاں ہر دائرہ کے ظاہر و باطن دونوں میں ہیں۔

قرآن حکیم نے کائناتی نعمتوں کے صرف ظاہر کو بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کی باطنی حقیقتوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ :

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً [2]

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کی چیزوں کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے اور ہر قسم کی ظاہری باطنی نعمتیں پوری کی ہیں۔

اسباغ کے اصل معنی وسیع اور کشادہ کرنے کے ہیں۔ یہ وسعت وکشادگی باطنی حقیقتوں کی دریافت اور ان تک رسائی ہی سے پوری ہوتی ہے۔

کرشمہ سازیاں اللہ کی طرف سے نفع رسانی کے لیے ہیں

کائنات میں جس قدر کرشمہ سازیاں ہیں، وہ سب اللہ کی طرف سے ودلیعت

[1] عبدالحمید فراہی، مفردات القرآن [2] لقمان آیت ۲۰۔

کردہ، مقرر کردہ اور انسان کی نفع رسانی کے لیے ہیں نہ کہ ہلاکت و بربادی کے لیے۔

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ [1] — یہ سب اللہ عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے۔

اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ۔ — تم بھی میزان میں تجاوز نہ کرو اور ٹھیک تولو

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ [2] — پورے انصاف کے ساتھ اور وزن میں کمی نہ کرو۔

کائنات سے متعلق متعدد آیات ہیں وہ العموم لام کے ساتھ ہیں جو نفع کے لیے آتا ہے۔ مثلاً

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا [3] — اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ [4] — اللہ ہی نے تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے ان چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ سب کو اپنی طرف سے۔

مطالعہ کائنات نوری پیکر کے جلو میں مطلوب ہے

کائنات کا مطالعہ

اسی روشنی میں جو اللہ نے روشن کیا ہے اور اسی نوری پیکر کے جلو میں جو ہدایت الٰہی نے تیار کیا ہے ہلاکت و بربادی سے محفوظ رکھتا ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا [5] — اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ [6] — آپ کہہ دیجئے میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں وہ یہ کہ تم اللہ کی خاطر دو دو ایک ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ پھر غور کرو تمہارے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔

---

[1] یٰسٓ آیت ۳۸ [2] رحمٰن آیت ۹/۱۰ [3] بقرہ آیت ۲۹ [4] جاثیہ آیت ۱۳
[5] تغابن آیت ۵ [6] سبا آیت ۴۶۔

یہ نوری پیکر ہر نبی اور اُس کی لائی ہوئی ہدایت نے تیار کیا لیکن اس پر سبھی کا اتفاق ہے کہ وہ اصلی شکل میں محفوظ نہیں رہا۔ صرف قرآن ہی ایسا ہدایت نامہ ہے، جو کامل وجامع شکل میں خود ہی محفوظ ہے اور اس میں یہ نوری پیکر بھی محفوظ ہے جس کے جلو میں کائنات کا مطالعہ مطلوب ہے کہ اس کے بغیر ہلاکت و بربادی سے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

(بقیہ: چند دردمندانہ تجاویز)

ہیں گو اب کسی درجہ میں ان کا سدباب کیا گیا ہے لیکن چور اچھی ہیرا پھیری سے باز نہیں آ رہا جس کا سدباب ضروری ہے۔

اور ابتدا سے لے کر انتہا تک پورے ملک میں طلبہ کے لئے ایک یونیفارم لازم ہو تاکہ طلباء میں طبقاتی کشمکش اور اس قسم کے مفاسد پیدا نہ ہوں۔ اور وہ وحدت میں پروئے جائیں۔ آخری درجہ میں "درسگاہ" آتی ہے جس کی عمارت، ماحول اور ہر چیز میں قومی وقار اور ملی روایات کی جھلک نظر آئے، آپ نے دیکھا انگریز نے ہر نوع کی عمارت کو ایک قسم کا گرجا بنا کر چھوڑ دیا تھا جو اس کے احساس حکمرانی یا غاصبانہ قبضہ کی نشانی تھی، ہماری عمارات بالخصوص درسگاہیں ایسی ہوں جن میں مسجد کا سا تقدس ہو کہ ہماری تو مسجد ہی اصل درسگاہ ہے، درسگاہ کا ماحول اتنا پاکیزہ ہو کہ اس میں فرشتوں کی سی صفائی و پاکیزگی نظر آئے۔ طلباء بطور خاص اسے اپنے گھر سے زیادہ قیمتی خیال کریں اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی جائے کہ ان کا علم جہاں اساتذہ، کتابوں اور اپنی محنت کا نتیجہ ہے وہاں یہ دیواریں اور چھتیں بھی حصہ دار ہیں۔

اگر ان باتوں کا لحاظ و اہتمام کر لیا جائے تو امید قوی ہے کہ تعلیم میں جس زوال کا ہم رونا رو رہے ہیں وہ ختم ہو جائے گا اور ہماری درسگاہوں میں فی الحقیقت شرافت و نیکی اور تقوی و طہارت کے پیکر پروان چڑھ سکیں گے۔

'مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت' (آخری قسط)

مضاربت اور قیاسی دلائل

مولانا محمد طاسین

قراض و مضاربت کے جواز کے لئے فقہاء کرام نے جو عقلی اور قیاسی قسم کی دلیلیں پیش فرمائی ہیں ان میں سے ایک یہ کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس تجارت کے لئے سرمایہ تو ہوتا ہے لیکن کسی عذر جیسے بیماری، بڑھاپے، ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ خود تجارت کا کام نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف ایک شخص کے اندر تجارتی کام کرنے کی صلاحیت اور واقفیت ہوتی ہے وہ پاتا ہے کہ کام کرے لیکن اس کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا گویا ایک کو اپنی منفعت کے لئے کام و عمل کی حاجت اور دوسرے کو سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا عقل کا تقاضا یہ ہے کہ مضاربت جیسا معاملہ جائز ہو تاکہ ہر فریق کی حاجت و ضرورت پوری ہو اور ہر ایک کو فائدہ پہنچے، اس دلیل میں پہلے تو کلام کی کافی گنجائش ہے اور اگر اس کو بلا چون و چرا صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے صرف ایسے لوگوں کے لئے مضاربت کا جواز نکالا جا سکتا ہے جن کا اس میں ذکر ہے یعنی معذور اور ضرورت مند لوگوں کے لئے غیر معذوروں اور غیر ضرورت مندوں کے لئے اس کا جواز ثابت نہیں کیا جا سکتا جو اپنے مال کے ساتھ خود تجارت کر کے کما کھا سکتے ہیں۔ گویا اس دلیل سے عام لوگوں کے لئے مضاربت کا جواز پیدا نہیں ہوتا بعض خاص قسم کے لوگوں کیلئے پیدا ہوتا ہے۔ جن کی تعداد معاشرے میں پانچ فی سدھی نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ جس چیز کا جواز مثلاً پانچ دس فی صد افراد کے لئے ان کے مخصوص حالات کی وجہ سے ہو اسے سو فیصد افراد کے لئے جائز قرار دینا خلاف عقل و دانش ہے، دین اسلام میں معذور لوگوں کے لئے جو رخصتیں اور مراعات ہیں وہ انہی تک محدود ہیں جو عذر رکھتے ہوں۔ غیر معذوروں کے لئے ان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوتا، مثلاً مسافر کے لئے جو مراعات ہیں مقیم ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اسی طرح مریضوں کے لئے جو

مراعات ہیں تندرستوں اور صحت مندوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان سے فائدہ اٹھائیں غرضیکہ جو قانون معاشرے کی اکثریت کے عمومی حالات سے تعلق رکھتا ہو وہ تو معاشرے کے کل افراد پر لاگو اور جاری ہو سکتا ہے لیکن جو قانون تھوڑی سی اقلیت کے مخصوص حالات سے تعلق رکھتا ہو وہ معاشرے کے سب افراد پر جاری نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں ذیل مذکورہ دو فریقوں کی جس ضرورت کا ذکر ہے اس کے پورے ہونے کے لئے محض مضاربت کا ہی طریقہ نہیں بلکہ اسلامی معاشرے میں کچھ دوسری صورتیں بھی ہیں جن سے ہر دو فریق کی وہ ضرورت پوری ہو جاتی اور مضاربت کو اختیار کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی، مثلاً اسلام کی تعلیم ہے کہ معاشرے کے جن افراد کے پاس ضرورت سے زائد مال ہو وہ دوسرے ضرورتمند افراد کو صدقہ و ہبہ کے طور پر دیں، اگر صدقہ و ہبہ کے طور پر نہ دے سکتے ہوں تو پھر قرض حسنہ کے طور پر دیں لہٰذا ظاہر ہے کہ اس سے اس تجارت پیشہ شخص کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے جو تجارت کے لئے سرمائے کا محتاج ہوتا ہے علاوہ ازیں کسب معاش کا طریقہ صرف تجارت اور خرید و فروخت ہی تو نہیں جس کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اور طریقے بھی ہیں جن کیلئے زر و نقدی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً محنت و مشقت اور نوکری و ملازمت کا طریقہ جس میں کام کرنے والے کو متعین اجرت ملتی ہے یا صنعت و حرفت کا طریقہ جس میں تھوڑے مال سے بھی کام چل جاتا ہے، اسی طرح اسلام چونکہ اسلامی حکومت پر لازم ٹھہراتا ہے کہ وہ ایک ایسا اجتماعی بیت المال قائم کرے جو معاشرے کے ایسے افراد کو مالی سہارا دے اور ان کی معاشی کفالت کرے جو محتاج و نادار ہونے کے ساتھ ساتھ کسی عذر کی وجہ سے معذور ہوں اور خود محنت و مشقت کر کے کما کھا نہ سکتے ہوں لہٰذا معاشرے میں بیت المال کا نظام ہوتے ہوئے کسی معذور فرد کو کبھی یہ فکر و تشویش لاحق نہیں ہوتی کہ اس کے پاس جو مال ہے وہ ختم ہو گیا تو پھر اس کا کیا بنے گا اور کیسے گزارہ ہوگا۔

حاصل یہ کہ جس ضرورت کے حوالے سے دلیل مذکور کو جواز مضاربت کے لئے پیش کیا جاتا ہے اگر فی الواقعہ وہ ضرورت صرف مضاربت ہی سے پوری ہو سکتی ہوتی تو دلیل ضرور کارآمد اور مفید ہو سکتی تھی لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا وہ ضرورت دوسرے طریقوں سے بھی پوری ہو سکتی ہے لہٰذا یہ دلیل کمزور اور غیر مؤثر ہے اور اس سے مضاربت کا قطعی جواز نہیں نکلتا۔

دوسری قیاسی دلیل جو مضاربت کے جواز میں پیش کی گئی ہے وہ یہ کہ چونکہ مضاربت

کا معاملہ، مزارعت سے ملتا جلتا ہے اور مزارعت کا معاملہ جائز ہے لہٰذا مضاربت کا معاملہ بھی جائز ہونا چاہیئے۔ یہ دلیل جس درجہ سے کمزور اور ناقابلِ اعتماد ہے وہ یہ کہ اس میں جس مزارعت پر مضاربت کو قیاس کیا گیا اس کا جواز و عدم جواز خود ایک اختلافی و نزاعی مسئلہ ہے بعض علماء اس کے جواز اور بعض عدم جواز کے قائل ہیں مثلاً درجہ اوّل کے چار ائمہ مجتہدین جن کی طرف چار فقہی مذاہب منسوب ہیں ان میں سے امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ مستقلاً اس کی ہر شکل کو باطل و ناجائز کہتے ہیں اور امام احمد بن حنبلؒ بھی سوائے ایک شکل کے جس میں بیج مالکِ زمین کی طرف سے ہو باقی سب شکلوں کو ناجائز گردانتے ہیں البتہ صاحبین یعنی امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں سے امام محمدؒ شیبانی اور قاضی ابویوسفؒ نے اس کی بعض شکلوں کو جائز اور بعض کو ناجائز لکھا ہے بلکہ قاضی ابویوسفؒ نے تو الٹا مزارعت کے جواز کو مضاربت کے جواز پر قیاس کیا ہے، بہرحال دلائل سے قطع نظر یہ واقعہ ہے کہ چوٹی کے ائمہ مجتہدین کی اکثریت کے نزدیک مزارعت باطل، فاسد اور ناجائز معاملہ ہے لہٰذا مضاربت کو مزارعت پر قیاس کرنا غلط اور فاسد قیاس ہے۔

مضاربت کے جواز کے لئے ایک اور قیاسی دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ "الخراج بالضمان" جس کے معنے ہیں: جو شخص بصورت ہلاکت کسی شے کا تاوان برداشت کرتا ہے وہ اس کے فائدے کا بھی حقدار ہوتا ہے اور چونکہ مضاربت میں ربّ المال نقصان کی صورت میں نقصان برداشت کرتا ہے۔ لہٰذا نفع کی صورت میں قاعدہ مذکورہ کی رُو سے وہ نفع کا بھی مستحق قرار پاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ مضاربت جائز ہے

اس دلیل میں جو خامی اور کمزوری ہے اسے واضح کرنے سے پہلے یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ اس دلیل میں جو قاعدہ کلیہ بیان کیا گیا ہے یہ دراصل ایک حدیثِ نبویؐ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص موقع پر ارشاد فرمائی جب دو شخص ایک جھگڑا لے کر آپؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے جن میں سے ایک نے دوسرے سے اس شرط پر غلام خریدا کہ اگر اس میں کوئی عیب نکلے گا تو واپس کر دیا جائے گا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد اس میں ایک عیب ظاہر ہوا لہٰذا خریدار نے غلام اس کے مالک کو واپس کر دیا۔ اب مالک نے خریدار سے اس فائدے کا مطالبہ کیا جو خریدار نے غلام سے اٹھایا تھا، اس میں ان کے درمیان نزاع ہوا اور تصفیے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے

حضورؐ نے خریدار کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے فرمایا "الخراج بالضمان" مطلب یہ کہ جس نے ان دنوں میں غلام کے کھانے پینے وغیرہ کا خرچہ برداشت کیا وہی اس فائدے کا بھی حق دار ہے جو اس نے غلام سے اٹھایا۔ یا یہ کہ ہلاکت کی صورت میں جو تاوان کا ذمہ دار ٹھہرتا وہی اس شے کے فائدے کا بھی مستحق ہوتا ہے ۔

چونکہ اس حدیث میں خراج سے مراد غلام کا وہ فائدہ ہے جو اس کی سعی و محنت سے خریدار کو حاصل ہوا۔ اور ضمان سے مراد وہ مالی خرچہ ہے جو خریدار یا تا حکم متنازعہ مالک کو غلام کی ضروریات پر برداشت کرنا پڑتا یا وہ تاوان ہے جو غلام کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں خریدار کو مالک کے لیے ادا کرنا پڑتا۔ بہرحال ضمان سے جو بھی مراد ہو لیکن خراج کا مطلب صرف وہ فائدہ ہے جو غلام کی سعی و محنت سے ضرور وجود میں آتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مضاربت کے اندر زر نقدی کی شکل میں جو مال ہوتا ہے وہ جامد و بے جان شے ہونے کی وجہ سے کسی چیز کو پیدا نہیں کرتا بلکہ مضاربت میں بصورت نفع جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ عامل کی دماغی جسمانی محنت و مشقت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لہٰذا حدیث مذکور میں جو قاعدہ کلیہ ہے وہ پوری طرح مضاربت پر منطبق نہیں ہوتا۔ دوسرے اس لئے بھی کہ مضاربت میں عموماً رب المال اپنے اصل مال کے ساتھ جو زائد مال بصورت نفع لیتا ہے وہ بغیر کوئی نقصان اٹھائے یونہی مفت میں لیتا ہے یعنی ضمان کے بغیر خراج لیتا ہے مطلب یہ کہ مضاربت میں نقصان کا احتمال تو ہوتا ہے لیکن وقوع بہت کم اور شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ لہٰذا اس پر قاعدہ مذکورہ اس طرح صادق نہیں آتا جس طرح کہ اجارے اور کرائے کے معاملہ پر صادق آتا ہے جس میں کرائے پر دی ہوئی چیز استعمال سے گھستی اور مالیت میں گھٹتی ہے۔ اور مالک جو کرایہ لیتا ہے اس کے عوض ضرور کچھ نہ کچھ نقصان برداشت کرتا ہے گویا اس میں خراج کے ساتھ ضمان ضرور پایا جاتا ہے ۔

پھر جہاں تک قیاس کا تعلق ہے بعض فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ معاملۂ مضاربت جائز نہیں ہونا چاہئے مثلاً علامہ کاسانیؒ اپنی کتاب بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں : اما الاول : فالقیاس انہ لایجوز لانہ استیجار باجر مجہول بل باجر معدوم والعمل مجہول لکنا ترکنا القیاس بالکتاب والسنۃ والاجماع ' پس جہاں تک مضاربت کے جواز کا تعلق ہے قیاس یہ چاہتا ہے کہ وہ جائز نہ ہو کیونکہ اس میں

ہو وہاں بلکہ معدوم اجرت کے عوض دوسرے سے کام لیا جاتا ہے اور کام بھی وقت و مقدار کے لحاظ سے مجہول وغیر متعین ہوتا ہے، لیکن ہم نے کتاب، سنت اور اجماع کی وجہ سے قیاس ترک کر دیا۔

مناسب ہوگا اگر یہاں کچھ ان دلائل کا بھی ذکر کر دیا جائے جو علامہ کاسانی نے جواز مضاربت کے لئے کتاب، سنت اور اجماع سے نقل فرمائے ہیں۔ کتاب اللہ سے انہوں نے تین آیات نقل فرمائی ہیں: ایک سورہ المزمل کی یہ آیت: وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ دوسری سورہ الجمعہ کی یہ آیت: فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ اور تیسری سورہ بقرہ کی آیت: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ۔ لیکن جیسا کہ پیچھے تفصیل کے ساتھ عرض کیا گیا کہ تینوں آیات مطلق تجارت سے متعلق ہیں مضاربت والی تجارت سے متعلق نہیں لہٰذا ان سے مضاربت کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ سنت سے انہوں نے حضرت عباس والی حدیث ذکر کی ہے جسے کئی وجوہ سے محدثین نے ضعیف کہا ہے۔ میں پیچھے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔ سنت سے دوسری دلیل یہ بیان فرمائی ہے کہ عہد رسالت میں لوگوں کا مضاربت پر عمل تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا۔ گویا سنت تقریری سے اس کا جواز ثابت ہے۔ میں پیچھے علامہ ابن حزم کے قول پر بحث کے ضمن میں اس کے متعلق بھی کچھ لکھ چکا ہوں۔ اجماع کے ذکر میں موصوف نے لکھا ہے کہ روایات بتلاتی ہیں کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے اپنے زیر تولیت یتیموں کا مال دوسروں کو مضاربت پر دیا اور کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ دوسرے صحابہؓ نے اس سے انکار کیا ہو تو گویا اس پر صحابہؓ کا اجماع ہوا۔ یاد ہوگا کہ میں پیچھے ان سب روایات کو نقل کر کے عرض کر چکا ہوں کہ ان روایات کو اگر صحیح مان لیا جائے تو ان سے یتیموں کی حد تک جو خود کام کرنے اور کمانے سے معذور ہوتے ہیں مضاربت کا جواز نکلتا ہے غیر یتیموں اور غیر معذوروں کے لئے عمومی جواز نہیں نکلتا۔

خلاصۂ بحث: مضاربت کی شرعی حیثیت سے متعلق گذشتہ صفحات میں جو تفصیلی بحث کی گئی اس کا خلاصہ یہ کہ مضاربت کے جواز میں کتاب، سنت، اجماع اور قیاس سے جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جن کا نہ مضاربت سے کچھ تعلق ہے اور نہ مضاربت کے جواز پر دلالت کرتے ہیں، البتہ کچھ دلائل ایسے ہیں جن سے مضاربت

کا جواز نکلتا ہے لیکن وہ جواز وجوب اور استحباب کے درجہ میں نہیں بلکہ مکروہ کے درجہ کا ہے۔ اس کا ترک کرنا اختیار کرنے سے بہتر ہے، اور یہ کہ مضاربت گو ربوٰ کی طرح حرام نہیں ممنوع نہیں لیکن معاملۂ بیع کی طرح حلال اور مشروع بھی نہیں جس میں کوئی شخص اپنے مال کے ساتھ خرید و فروخت کی شکل میں خود کام محنت کرتا اور نفع کماتا ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا معاملہ ہے جو ایک پہلو سے معاملۂ بیع کے مشابہ اور دوسرے پہلو سے معاملۂ ربوٰ کے مماثل ہے لہٰذا اس معاملہ کو نہ حلال بیّن کہہ سکتے ہیں اور نہ حرام بیّن، بلکہ ان معاملات میں سے ایک کہہ سکتے ہیں جن کو حدیث مذکور میں مشتبہات سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور جن سے بچنے اور احتراز کرنے کی اس میں ترغیب اور تاکید ہے۔

علاوہ ازیں مضاربت کی شرعی حیثیت پر کچھ اس سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ، یقین کرو کہ اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا اور عدل اور احسان چاہتا ہے۔ اس آیت مبارکہ کا تقاضا ہے کہ مسلمان باہمی معاملات میں عدل اور احسان اختیار کریں جو معاملات عدل اور احسان کے مطابق ہوں وہ اختیار کریں اور جو عدل اور احسان کے مطابق نہ ہوں ان سے بچیں اور احتراز کریں۔ اس کی روشنی میں جب ہم معاملۂ مضاربت کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معاملہ نہ احسان کے مطابق نظر آتا ہے اور نہ عدل کے مطابق، کیونکہ احسان اس بارے میں یہ ہے کہ ضرورت مند کو مال صدقہ و ہدیہ یا قرض حسنہ کے طور پر دیا جائے، نفع کے ایک حصّہ پر دینا احسان نہیں، اور عدل کے مطابق یہ معاملہ اس لئے نہیں کہ عدل اس بارے میں یہ ہے کہ جس کی سعی و محنت سے کوئی مال اور نفع وجود میں آیا ہو وہ سب کا سب اسی کو ملے اس میں کوئی دوسرا شریک اور حصّہ دار نہ ہو جس نے نہ کوئی سعی و محنت کی ہو اور نہ فی الواقع کوئی مالی نقصان برداشت کیا ہو، اور ظاہر ہے کہ بصورت نفع مضاربت میں سرمائے والا فریق اپنے اصل سرمائے کے ساتھ جو زائد نفع لیتا ہے اس کے بدلے اس کی طرف سے نہ کوئی سعی و محنت موجود ہوتی ہے اور نہ حقیقی طور پر کوئی مالی نقصان موجود ہوتا ہے، لہٰذا یہ معاملہ عدل کے خلاف ہے، جہاں تک نقصان کی صورت میں نقصان برداشت کرنے کی ذمّہ داری کا تعلق ہے وہ حقیقت میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس مال کا صحیح بدل بن سکتی ہو جسے سرمائے والا فریق نفع کے نام سے لیتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس ذمّہ داری کی وجہ سے ——

اس کے لئے نفع لینے کا نہائت کمزور سا جواز پیدا ہو جاتا اور جس کی وجہ سے معاملہ مضاربت معاملہ ربوٰ سے جا معاملہ قرار پاتا اور اس سے بہتر ہوتا ہے۔

یہاں اگر یہ کہا جائے کہ مضاربت میں جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ محنت اور سرمائے دونوں سے وجود میں آتا ہے لہٰذا جس طرح محنت سے پیدا شدہ حصے کا محنت کرنے والا حق دار ٹھہرتا ہے اسی طرح سرمائے سے پیدا شدہ حصے کا حق دار سرمائے والا قرار پاتا ہے بنا بریں نفع کی صورت میں سرمائے والا نفع کا جو حصہ لیتا ہے وہ اس کا حق ہوتا اور وہ اپنا حق لیتا ہے لہٰذا یہ معاملہ عدل کے خلاف نہیں بلکہ عین مطابق ہوا، تو اس کا جواب یہ کہ یہ بات اس صورت میں صحیح ہو سکتی تھی جب سرمایہ بھی کسی مال و دولت کو پیدا کرتا ہوتا حالانکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ کوئی سرمایہ اپنے وجود کو جوں کا توں برقرار رکھتے ہوئے کسی چیز کو پیدا نہیں کرتا، پھر جہاں تک اس سرمائے کا تعلق ہے جو مضاربت میں زر و نقدی اور روپوں پیسوں کی شکل میں رب المال عامل کو دیتا ہے تو یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا ہر کوئی مشاہدہ کرتا ہے کہ یہ سرمایہ تجوری وغیرہ میں پڑا ہو تو خواہ کتنا ہی طویل زمانہ اس پر گزر جائے کبھی اس کی مقدار و تعداد میں کوئی اضافہ رونما نہیں ہوتا، اسی طرح چونکہ یہ ایک بے جان اور بے حس و حرکت چیز ہے لہٰذا یہ کبھی کسی شے کو پیدا بھی نہیں کر سکتا، نیز استعمال سے اس کی قیمت اور مالیت میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، جس طرح کہ کرائے پر دی ہوئی کسی چیز کی قیمت و مالیت میں واقع ہوتی ہے جو استعمال ہونے سے گھستی اور پرانی ہوتی رہتی ہے۔ اور کرائے کے جواز کا سبب بنتی ہے۔

دراصل یہ اصول کہ محنت کی طرح سرمایہ بھی مال و دولت کو پیدا کرتا ہے۔ نظام سرمایہ داری کا بنیادی اصول ہے۔ یہ اصول جہاں حقیقت واقعہ کے لحاظ سے غلط و باطل ہے وہاں ان بے شمار مفاسد کا بھی باعث ہے جن کی وجہ سے نظام سرمایہ داری ایک بدترین اور مردود نظام ہے، حقیقت واقعہ کے لحاظ سے یہ اصول اس لئے غلط ہے کہ حقیقت میں مال جو بھی پیدا ہوتا ہے قدرتی مادے اور انسانی محنت سے پیدا ہوتا ہے یعنی جب کوئی انسان کسی قدرتی شے میں اپنی سعی و محنت سے ایسا تصرف اور رد و بدل کرتا ہے جس سے اس کی قدرتی افادیت میں ایک نئی افادیت پیدا ہو جاتی ہے تو یہ شے ایک اعتبار سے دولت اور دوسرے اعتبار سے سرمایہ کہلاتی ہے یعنی اگر وہ شخص اس شے کو ذاتی صرف و استعمال

کے لئے مخصوص کرلیتا ہے تو اس اعتبار سے معاشیات کی اصطلاح میں اسے دولت (ویلتھ) اور اگر اس کو مزید کمائی کا ذریعہ بنا لیتا ہے تو اصطلاح میں اسے سرمایہ کہا جاتا ہے مثلاً جو مکان اپنی رہائش کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو وہ اس کی دولت اور جو کرائے پر چلانے کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو وہ اس کا سرمایہ یعنی کیپٹل ہے، گویا دولت اور سرمائے کے درمیان حقیقی فرق نہیں بلکہ محض اعتباری فرق ہے۔ ایک ہی شے ایک اعتبار سے دولت اور دوسرے اعتبار سے سرمایہ کہلاتی ہے اور پھر اس شے کی ماہیت کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو چیزوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتی: ایک کوئی قدرتی مادہ اور دوسری انسانی محنت کے اثرات جن کی وجہ سے قدرتی مادے نے ایک خاص شکل اختیار کی۔ مطلب یہ کہ حقیقت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ جس چیز کو ہم دولت و مال کہتے ہیں وہ صرف دو چیزوں سے وجود میں آتی ہے ایک کسی قدرتی مادے سے اور دوسری انسانی سعی و محنت کے اثرات سے۔ ان دو کے سوا سرمایہ نام کی تیسری کوئی چیز اس کو پیدا نہیں کرتی۔ یہ الگ بات ہے کہ سرمائے کا وجود ہر کاروبار کے لئے ضروری ہوتا ہے، تجارت، صنعت اور زراعت کوئی بھی سرمائے کے بغیر ممکن نہیں لیکن کسی چیز کا دوسری چیز کے لئے ضروری ہونا اور بات ہے اور کسی چیز کا دوسری چیز کو پیدا کرنا اور بات۔ دونوں کے درمیان کوئی تلازم نہیں یعنی عقلاً یہ لازمی نہیں کہ جو چیز دوسری کے لئے ضروری ہو وہ اس کو پیدا کرنے والی بھی ہو۔

اسی طرح یہ بھی ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ زر و نقدی کے سوا ہر سرمایہ جو کسی کاروبار میں استعمال ہوتا ہے استعمال ہونے سے جزوی یا کلی طور پر تحلیل ہوتا اور اس پیداوار میں اضافے کا باعث بنتا ہے جو انسانی محنت سے وجود میں آتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس سرمائے نے کسی چیز کو پیدا کیا کیونکہ پیدا کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز اپنے وجود کو جوں کا توں برقرار رکھتے ہوئے دوسری چیز کے وجود کا باعث بنی اور چونکہ اس صورت میں سرمائے کا وجود جوں کا توں برقرار نہیں رہتا بلکہ جزوی یا کلی طور پر تحلیل ہو جاتا ہے لہٰذا یہ نہیں کہہ سکتے کہ سرمائے نے پیداوار کے ایک حصہ کو پیدا کیا۔

پھر یہ بات جس طرح حقیقت واقعہ کے لحاظ سے غلط ہے کہ سرمایہ بھی دولت کو پیدا کرتا ہے اسی طرح ان برے اثرات و نتائج کے لحاظ سے بھی باطل ہے جو اس بات کو ماننے اور اس پر عمل کرنے سے لازماً وجود میں آتے اور معاشرے کے لئے بدامنی و

بے چینی اور تباہی و بربادی کا باعث بنتے ہیں، مطلب یہ کہ جس معاشرے میں سرمائے والے فریق کو بغیر کسی مفید محنت و مشقت کے محض اس بنا پر کاروبار کے منافع کے ایک حصّہ کا حق دار ٹھہرایا جاتا ہو کہ کاروبار میں اس کا سرمایہ استعمال ہوا ہے اس میں لازمی ہے کہ ملکی دولت چند ہاتھوں میں سمٹے اور وسائلِ دولت پر چند افراد کی اجارہ داری قائم ہو اور ان کی مرضی کے مطابق ملکی معیشت کی گاڑی چلے، ایسے معاشرے میں غیر فطری قسم کا معاشی عدم توازن ضرور رونما ہو کر رہتا ہے کہ ایک طرف چند کروڑوں اور اربوں پتی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف عظیم اکثریت کو بنیادی ضروریات تک پوری طرح میسّر نہیں ہوتیں اور وہ معاشی پریشانیوں کا شکار رہتی ہے اور اس سے طرح طرح کی معاشرتی برائیاں اور سماجی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ اور معاشرے کو کھوکھلا کر کے رکھ دیتی ہیں اس میں طبقاتی تصادم کا ہمیشہ اندیشہ رہتا اور وقتاً فوقتاً ایسے حالات رونما ہوتے رہتے ہیں جو پورے معاشرے کے لئے بدامنی و بے چینی کا سبب بنتے ہیں اور کسی کو پائدار سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوتا، اسلام چونکہ پائدار امن و سلامتی کا علمبردار ہے لہٰذا اس کے نزدیک ہر وہ اصول و نظریہ باطل قرار پاتا ہے جس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں باہمی نزاع و تصادم کا دروازہ کھلتا اور بدامنی و بے چینی وجود میں آتی ہو، اور چونکہ سرمائے کو پیدائش دولت کا ذریعہ ماننا بھی ایسا ہی تصوّر ہے لہٰذا اسلام کی رو سے باطل اور مردود ہے۔

خلاصہ یہ کہ معاملۂ مضاربت نہ احسان کی تعریف میں آتا ہے اور نہ پوری طرح عدل کی تعریف میں اور اسلام چونکہ عدل اور احسان چاہتا ہے۔ لہٰذا یہ معاملہ منشائے اسلام کے مطابق نہیں اور اس کو صحیح اسلامی معاملہ کہنا مشکل ہے البتہ یہ ربٰو سے ضرور بہتر ہے، چنانچہ اگر کسی معاشرے میں خاص طرح کے ذہنی اور خارجی حالات کی وجہ سے ربٰو کا عام رواج ہو اور اسے دفعتہً ختم کرنے میں شدید ردِّعمل ظاہر ہونے اور معاشرے کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں ربٰو کو ختم کرنے کا صحیح طریق کار یہ ہے کہ اسے بتدریج اور مرحلہ بمرحلہ ختم کیا جائے لہٰذا اس میں کسی مرحلہ پر ربٰو کی جگہ مضاربت کو اختیار کر لیا جائے تو ایسا کرنا جائز اور بہتر ہوگا کیونکہ یہ ایک اسلامی قاعدہ ہے کہ جب دو برائیوں میں سے ایک کا اختیار کرنا ناگزیر ہو تو اس کو دینی طور پر اختیار کر لیا جائے جو نسبتاً کم درجہ کی ہو، لیکن عبوری طور پر مضاربت کو اختیار کرنا اس ارادہ سے ہو کہ آگے

چل کر اسے چھوڑ دیا جائے جب مطلوبہ ذہنی اور خارجی حالات وجود میں آجائیں گے۔ کیونکہ مضاربت جیسے غیر عادلانہ معاملات کے ذریعے وہ معتدل و متوازن معاشی ماحول کبھی وجود میں نہیں آسکتا جو اسلام اپنے مجوزہ مثالی معاشرے کے اندر موجود دیکھنا چاہتا ہے یعنی ایسا معاشی ماحول جس میں بلا کسی تخصیص و امتیاز ہر ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں بنیادی معاشی ضروریات بھی میسر ہوں جن کے بغیر عام طور پر ایک انسان اپنی طبعی عمر تک نہ اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکتا اور نہ اپنے ضروری فرائض صحیح طریقے سے ادا کر سکتا ہے۔ جو مختلف حیثیات سے اس پر عائد ہوتے ہیں نیز اس میں ہر ہر فرد کو معاشی ترقی یعنی ضرورت سے زیادہ سامان معاش حاصل کر سکنے کا موقع بھی حاصل ہو مطلب یہ کہ اگر وہ حاصل کرنا چاہے تو اپنی صلاحیتوں کے مطابق مناسب طور پر حاصل کر سکے آگے اس کی مرضی کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، بلکہ ایسا معاشی ماحول صرف ان اعمال و معاملات کے ذریعے وجود میں آسکتا ہے جو کامل عدل پر مبنی اور حقیقی طور پر اسلامی اعمال و معاملات ہیں اور جن کی وجہ سے اسلام کے معاشی نظام کی غیر اسلامی معاشی نظاموں پر فوقیت و برتری ثابت کیجا سکتی ہے

آخر میں یہ واضح کر دینا نہایت ضروری ہے کہ میں نے اس مقالے میں مضاربت کی شرعی حیثیت پر جو طویل بحث کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ سے مسلم ممالک میں یہ تحریک چل رہی ہے کہ ان کے ہاں جو غیر اسلامی نظام معیشت رائج ہے اسے اسلامی نظام معیشت سے بدلا جائے خصوصاً بنکاری اور سرمایہ کاری کے موجودہ نظام کو جو ربٰو کی بنیاد پر چل رہا ہے، ایسے نظام سے بدلا جائے جو ربٰو سے پاک اور منشأ اسلام کے مطابق ہو، چنانچہ اس مقصد کے تحت مختلف ممالک کے علماء کرام اور ماہرین اقتصادیات نے بنکاری اور سرمایہ کاری کا جو متبادل نقشۂ نظام تجویز کیا وہ تمام تر مضاربت کی بنیاد پر ہے اور پھر ان حضرات کی تحریروں میں مضاربت کا اس انداز سے ذکر اور پرچار ہے کہ گویا یہ معاملہ منشائے اسلام کے عین مطابق اور حقیقی طور پر اسلامی معاملہ ہے لہٰذا اس پر مبنی نظام بنکاری اور سرمایہ کاری بھی صحیح معنوں میں اسلامی نظام بنکاری و سرمایہ کاری ہے حالانکہ یہ درست نہیں جیسا کہ اس تفصیلی بحث سے ظاہر و واضح ہے جو اس مقالے میں پیش کی گئی ہے، بلکہ ان حضرات کی تحریروں سے ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے مضاربت کی شرعی حیثیت پر غور کرنے اور اسے سمجھنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور نہ کبھی پوری توجہ کے ساتھ معاشی عدل اور معاشی

نظم کے اس تصوّر کو جاننے کی کوشش فرمائی ہے جس کو اسلام نے معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز اور حلال و حرام میں سامنے رکھا اور جس کے مطابق کچھ معاشی معاملات کو جائز و حلال اور کچھ کو حرام و ناجائز ٹھہرایا ہے اور کبھی یہ سوچا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام اپنی جن خصوصیات کی بنا پر دوسرے معاشی نظاموں جیسے اشتراکیت اور سرمایہ داری سے بنیادی طور پر جدا اور افادی طور پر بہتر ہے۔ وہ خصوصیات کیا ہیں؟ اور یہ کہ جن برائیوں سے بچانے کے لئے اسلام نے ربٰو اور ربوی معاملات کو حرام قرار دیا ہے کیا مضاربت کے عام رواج سے وہ برائیاں معاشرے سے کلی طور پر ختم ہو جاتی ہیں یا اس کے باوجود بہت کچھ باقی رہتی ہیں! وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال جس طرح یہ درست نہیں کہ معاملہ مضاربت منشائے اسلام کے عین مطابق اور حقیقی طور پر ایک اسلامی معاملہ ہے اور یہ کہ اس کی بنیاد پر تشکیل شدہ نظام بنکاری و سرمایہ کاری صحیح معنوں میں اسلامی نظام بنکاری و سرمایہ کاری ہوگا اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ موجودہ حالات میں ایسا نظام بنکاری و سرمایہ کاری کامیابی کیساتھ چل سکتا ہے کیونکہ نظام بنکاری کے کامیابی کیساتھ چلنے کا مطلب یہ کہ یہ نظام جس مقصد کے تحت قائم ہوا ہے وہ مقصد پورے اور بہتر طور پر حاصل ہوتا رہے اور وہ مقصد یہ کہ ایک طرف کچھ لوگ کم شرح سود پر بنک کو زیادہ سے زیادہ قرضہ دیتے رہیں اور دوسری طرف کچھ لوگ زیادہ شرح سود پر بنک سے قرضے لیتے رہیں تاکہ اس کو زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو اور اس کا تموّل بڑھے، گویا بنک کا مقصد زر و نقدی کے لین دین کے ذریعے زیادہ سے زیادہ نفع کمانا اور اپنا تموّل بڑھانا ہے، اور یہ مقصد بنک کو جس طرح ربٰو سے حاصل ہوتا ہے اس طرح مضاربت سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ربٰو کی شکل میں لوگوں کو یہ وثوق و اطمینان ہوتا ہے کہ وہ بنک کو جو مال دیں گے وہ نہ صرف یہ کہ ان کو ضرور ملے گا بلکہ اضافے کے ساتھ ملے گا جبکہ مضاربت کی صورت میں نفع تو کجا اصل رقم واپس ملنے کا بھی وثوق نہیں ہوتا اور پھر نقصان کی صورت میں سارا نقصان رب المال کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ نیز چونکہ بنک کی حیثیت کسی محتاج و ضرورتمند انسان کی بھی نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسے متموّل اور دولت مند انسان کی سی ہوتی ہے جس کا مقصد اپنے تموّل کو بڑھانا اور اپنی دولت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو برتنے کے لئے مال دینا اور اس کے لئے نقصان برداشت کرنا کوئی ایسی نیکی نہیں جس پر مسلمان کو اجر و ثواب ملنے کی توقع ہو اور وہ رضائے الٰہی اور اجر اخروی کی خاطر خوشی

نقصان برداشت کرلے بلکہ ایسے ادارے کا تعاون شاید گناہ اور عدوان میں تعاون ہو۔
غرضیکہ بنک کو مضاربت پر مال دینے میں انسان کو نہ دنیوی فائدے کا یقین ہوتا ہے اور نہ
اخروی اجر وثواب کی کوئی امید بخلاف ربٰو کے کہ اس میں دنیوی فائدے کا یقین ہوتا ہے،
اور پھر آج عام طور پر مسلمانوں کی بھی ذہنی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا ضرورت سے زائد مال دوسرے
ضرورت مند مسلمانوں کو بھی اس وقت تک برتنے کے لئے نہیں دیتے جب تک کہ انہیں
یہ وثوق اور اطمینان نہ ہو کہ ان کا مال ان کو نہ صرف یہ کہ ضرور واپس ملے گا بلکہ اضافے اور
فائدے کے ساتھ واپس ملے گا تو پھر وہ بنک جیسے تجارتی ادارے کو اس کے بغیر کیسے
دے دیں گے۔

اسی طرح بنک جب کاروباری لوگوں کو قرض متعین شرح سود پر دیتا ہے تو اس کا
اصل مال بھی محفوظ رہتا اور اس میں اضافہ بھی یقینی ہوتا ہے، اور اگر مضاربت پر دیتا
ہے تو نہ اسی رقم کی واپسی کی ضمانت ہوتی ہے اور نہ نفع کا یقین ہوتا بلکہ محض
احتمال ہوتا اس کے ساتھ ساتھ آج عام طور پر کاروباری لوگوں کے حالات
ایسے ہیں کہ نہ وہ حساب کتاب صحیح رکھتے اور نہ دیانت وسچائی سے کام لیتے ہیں۔ لہٰذا ایسے
حالات میں بنک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ کچھ اور زیادہ ہو جاتا ہے لہٰذا اس کے مقصدِ وجود
کا یہ تقاضا ہے کہ وہ مضاربت پر دینے کی بجائے اپنا مال دوسروں کو ربٰو پر دے، بنابریں
یہ کسی طرح قرینِ قیاس اور مطابق عقل نہیں کہ موجودہ حالات میں نظام بنکاری مضاربت
کی بنیاد پر کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے سوائے اس کے کہ مضاربت کی شرعی حقیقت کو اس
طرح مسخ کیا اور بدل دیا جائے کہ وہ ربٰو ہی کی دوسری شکل بن کر رہ جائے جیسے کہ کچھ عرصہ پہلے
پاکستان میں ہوا ہے، پاکستان بنکنگ کونسل نے بنکوں میں شرکت ومضاربت کے نام
سے ایک شعبہ تجویز کیا اور اسے کھولنے سے پہلے ان کی طرف سے اخبارات میں اعلان ہوا
کہ جو لوگ اس شعبہ میں کھاتے کھولیں گے ان کی رقوم قرض کی طرح محفوظ بھی رہیں گی اور
سالانہ ساڑھے بارہ فیصد نفع بھی ملے گا اور دورانِ معاملہ سال میں دو مرتبہ نفع کی تقسیم
ہوا کرے گی۔ پھر غضب یہ کہ اس شعبہ کو اسلامی کا نام دیا گیا، اس کے بعد بنکنگ کونسل نے
اخبارات میں ایک اور اعلان کیا کہ وہ ایک عالیشان بلڈنگ بنانا چاہتے ہیں جس کے لئے اتنی
رقم درکار ہے، جو لوگ مضاربت کے طریقہ پر اس میں سرمایہ کاری کرنا اور حصہ لینا پسند کریں

ان کو ان کی اصل رقم پر ڈیڑھ سال میں پچیس فیصد منافع ملے گا۔ اس اسکیم کا نام "نوٹن مضاربہ" رکھا گیا۔ مطلب یہ کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں مضاربت اور شرکت کو جو عملی شکل دی گئی اس سے ان کی حقیقت بدل گئی اور وہ مضاربت اور شرکت باقی ہی نہ رہی کیونکہ جیسا کہ شروع مقالہ میں عرض کیا گیا کہ جس معاملہ میں سرمائے والے فریق کو یہ یقین دلایا جائے کہ اس کا سرمایہ بھی تمام تر اس کے لئے محفوظ رہے گا اور نفع بھی یقینی ملے گا، یا یہ کہ نفع نسبتی حصہ سے نہیں بلکہ سالانہ یا ماہانہ فیصد کے حساب سے ملے گا، یا یہ کہ معاملہ ختم ہونے سے پہلے نفع تقسیم ہوتا رہے گا، یا نقصان کی صورت میں کام کرنے والا فریق بھی نقصان میں شریک ہوگا وہ معاملہ کسی طرح مضاربت کا معاملہ نہیں رہتا بلکہ ربٰو کا معاملہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح جس معاملے میں سرمایہ دو آدمیوں کا ہو اور تجارتی کام و عمل دو کا نہیں بلکہ صرف ایک کا ہو، یا اس میں نفع کا تعین نسبتی حصہ سے نہیں بلکہ سرمائے کے فیصد کے حساب سے ہو تو ایسا معاملہ شرکت کا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ ربوی قسم کا معاملہ بن جاتا ہے لہٰذا ایسے معاملات پر مبنی نظام بنکاری و سرمایہ کاری کو اسلامی کہنا اسلام پر افتراء اور ظلم اور اسے بدنام کرنے کی بدترین کوشش ہے کیونکہ جہاں تک بنیادی ساخت اور عملی نتائج کا تعلق ہے اس نظام میں اور صریح ربٰو پر مبنی نظام میں کوئی خاص فرق نہیں، دونوں میں کھاتہ داروں کی اصل رقوم بھی محفوظ رہتی ہیں اور ان کو بغیر کسی محنت و مشقت کے سرمایہ کے فیصد کے حساب سے متعین اضافہ بھی ملتا ہے اور پھر دونوں سے ایک ہی طرح کے معاشی حالات بھی ظہور میں آتے ہیں تو پھر ان میں سے ایک نظام کو جائز اور اسلامی اور دوسرے کو ناجائز اور غیر اسلامی کہنا خلاف عقل و دانش اور ناقابل فہم بات ہے جو اللہ کے دین کی بات نہیں ہوسکتی۔ اس قسم کی کوششیں اور باتیں چند مفاد پرستوں کے لئے تو مفید ہو سکتی ہیں لیکن نہ اسلام کے لئے مفید ہو سکتی ہیں اور نہ عام مسلمانوں کے لئے اور سمجھدار قسم کے غیر مسلموں کے لئے تو ایسی باتیں مضحکہ خیز ہیں۔ وہ اسلام کے متعلق ہمارے اونچے دعووں کو ہماری ایسی باتوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو اسلام سے بدظن ہوتے اور ہمیں احمق اور محض شاعر سمجھتے ہیں۔

مقالہ ختم کرنے سے پہلے ایک سوال اور اس کا جواب عرض کر دینا مناسب اور مفید سمجھتا ہوں: سوال مختصر طور پر یہ کہ مشترک سرمائے کی کمپنیوں وغیرہ کے شیئرز و حصص،

کی خرید و فروخت کا جو معاملہ ہے کیا یہ مضاربت کے تحت آتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ کہ کئی وجوہ ہیں جن کی بنا پر یہ معاملہ مضاربت کی تعریف میں نہیں آتا: پہلی وجہ یہ کہ مضاربت کے لئے ضروری ہے کہ رب المال اور عامل مضارب کے درمیان براہِ راست لفظ مضاربت کے ساتھ معاہدہ ہو اور اس معاملہ میں اگر شیئرز ہولڈرز اور حصہ داروں کو رب المال اور کمپنی میں کام کرنے والے جملہ ملازمین کو یا کمپنی کے ڈائریکٹروں کو عامل مضارب کہا جائے تو ظاہر ہے کہ ان کے درمیان لفظ مضاربت سے کوئی معاہدہ نہیں ہوتا بلکہ عام طور پر وہ ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں ہوتے، پھر چونکہ کمپنی کے ڈائریکٹروں کا اور بعض ملازمین کا بھی سرمایہ لگا ہوتا ہے لہٰذا وہ خود بھی رب المال فریق میں شامل ہوتے ہیں، دوسری وجہ یہ کہ مضاربت کے لئے ضروری ہے کہ معاملہ شروع کرتے وقت دونوں فریقوں کے درمیان ان کی مساویانہ مرضی سے یہ طے ہو کہ اگر نفع ہوگا تو ان کے درمیان کس تناسب سے تقسیم ہوگا، جب کہ اس معاملہ میں نفع کی تعیین و تقسیم صرف ڈائرکٹروں کی مرضی سے طے پاتی ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ مضاربت کے لئے ضروری ہے کہ نفع کی صورت میں نفع رب المال اور عامل مضارب کے درمیان نسبتی حصہ سے تقسیم ہو جبکہ اس معاملہ میں عامل کا مصداق جو اصل لوگ ہوتے ہیں جن کی محنت و مشقت سے نفع وجود میں آتا ہے وہ کمپنی کے ملازم ہوتے اور انہیں ماہوار یا یومیہ متعین تنخواہ اور اجرت ملتی ہے۔ نفع کا ایک نسبتی حصہ نہیں ملتا، چوتھی وجہ یہ کہ مضاربت کے لئے ضروری ہے کہ جب معاملہ ختم ہو تو اس وقت فریقین کے درمیان نفع کی تقسیم ہو اس سے پہلے دورانِ معاملہ نفع کی تقسیم جائز نہیں ہوتی حالانکہ اس معاملہ میں دورانِ معاملہ عبوری منافع کے نام سے تقسیم ہوتی رہتی ہے، پانچویں وجہ یہ کہ بعض ائمہ مجتہدین کے نزدیک مضاربت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا پیسہ صرف خرید و فروخت کی تجارت میں لگے اسے صنعتی کاروبار میں لگانا درست نہیں حالانکہ اس معاملہ میں جمع شدہ سرمایہ صنعتی کاروبار میں بھی ضرور لگایا جاتا ہے۔ چھٹی وجہ یہ کہ مضاربت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سرمائے کو عامل کمانے کے کسی ایسے طریقہ میں نہ لگائے جو شرعاً حرام و ممنوع ہے۔ مثلاً اس سے سودی لین دین اور معدوم و غیر حاضر شے کی خرید و فروخت نہ کرے حالانکہ آج کل تجارتی کمپنیاں سودی لین دین بھی کرتی ہیں اور یہ بھی نہیں دیکھتیں کہ تجارت کی جائز و ناجائز صورتیں کیا ہیں ان

(بقیہ صـ۲۶ پر)

مزید اشکالات کے جوابات

(بسلسلۂ مُروّجہ نظامِ زمینداری اور اسلام)

مولانا محمد طاسین

پہلے یہ عرض کر دوں کہ کسی تحریر و تقریر سے متعلق اشکالات و اعتراضات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو واقعی اور بدیہی طور پر اس تحریر و تقریر سے پیدا ہوتے ہیں اور عام طور پر سمجھ میں آتے ہیں، اور دوسرے وہ جو ذہانت اور فنکاری کے ذریعے تکلّف کے ساتھ زبردستی پیدا کئے جاتے ہیں اور مخصوص ذہنیت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے اشکالات و اعتراضات سامنے لانا اور صاحبِ تحریر و تقریر سے ان کے جوابات طلب کرنا، اچھی روش ہے بشرطیکہ نیت نیک اور مقصد احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہو۔ صاحبِ تحریر و تقریر کو نیچا دکھانا اور خاص غرض کے تحت اس کی شخصیت کو مجروح و بدنام کرنا نہ ہو۔ اس قسم کے اشکالات و اعتراضات کا جواب دینا، صاحبِ تحریر و تقریر کی ذمّہ داری ہے اور اس صورت میں اور زیادہ، جب جواب نہ دینے سے کسی دینی مسئلہ کے متعلق شدید غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔ البتہ دوسری قسم کے اعتراضات کا جواب نہ دینا ہی بہتر ہوتا ہے جو یا تو ایسے اشخاص کی طرف سے سامنے آتے ہیں جن کا مزاج کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ان کو دوسروں پر اعتراضات کرنے میں مزہ آتا ہے۔ چنانچہ انہیں ان کے اعتراضات کا خواہ کتنا ہی اطمینان بخش جواب دیا جائے کبھی مطمئن نہیں ہوتے اور برابر اُلٹے سیدھے اعتراضات کئے چلے جاتے ہیں ــ وہ دوسرے کے تحریری جواب کو سمجھنے کے لئے نہیں پڑھتے بلکہ مزید اعتراضات کرنے کے لئے پڑھتے ہیں، یا اس قسم کے اعتراضات ایسے اشخاص کی طرف سے سامنے آتے ہیں جن کو صاحبِ تحریر و تقریر سے کسی دوسرے اختلاف وغیرہ کی وجہ سے ناراضی ہوتی ہے اور وہ اس طریقہ سے اپنی بھڑاس نکالتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے بحث و مباحثہ میں الجھنا، وقت اور توانائی کو ضائع کرنا ہوتا ہے۔

جناب محمد اکرم خاں صاحب کے تازہ اشکالات و اعتراضات کس قسم کے ہیں اس کا فیصلہ قارئین حکمتِ قرآن پر چھوڑتا ہوں۔ بہرحال اب جبکہ یہ اشکالات و اعتراضات، حکمتِ قرآن میں چھپ چکے ہیں تو بادلِ نخواستہ ہی سہی میرے لئے ان کا جواب دینا ضروری ہوگیا ہے۔ موصوف کے سوالات اگرچہ تین ہیں لیکن ہر سوال اپنے اندر کئی کئی اشکال و اعتراض لئے ہوئے ہے، میں سمجھتا ہوں ان کے تفصیلی جوابات کے لئے سینکڑوں صفحات درکار ہیں اور ان کے لئے جتنا وقت چاہیئے میرے پاس موجود نہیں۔ دراصل اعتراض کرنے کے لئے زیادہ علم و عقل کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن مفصّل جواب کے لئے اس کی شدید ضرورت ہوا کرتی ہے،

غلط فہمی پیدا کرنے سے غلط فہمی کا دور کرنا کہیں زیادہ مشکل ہوا کرتا ہے ۔ غرضیکہ میں نہایت اختصار کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کروں گا اس لئے بھی کہ قارئین حکمت قرآن کی بڑی اکثریت کے لئے یہ دلچسپی کا موضوع نہیں ۔

(۱) جناب محمد اکرم خان کے پہلے سوال کا تعلق میری اس عبارت سے ہے جو پچھلے مضمون میں سود اور افراط زر سے متعلق ایک اعتراض کے جواب میں لکھی گئی تھی اور جس کا کچھ حصہ جو مفید مطلب تھا موصوف نے نئے اعتراضات کے لئے نقل بھی فرمایا ہے یعنی انہوں نے میری اس وضاحت کو چھوڑ دیا جو مال حقیقی اور مال مجازی کے درمیان فرق سے متعلق مثال سے پیش کی گئی تھی ۔ میری نقل کردہ عبارت کا پہلا ٹکڑا اس طرح ہے : " زر کاغذی یعنی نوٹ حقیقی طور پر اور بذات خود مال نہیں بلکہ تبادل مال کا ذریعہ تسلیم کر لینے کی وجہ سے مجازی طور پر مال ہیں " اس پر موصوف نے نہایت سطحی قسم کا یہ اعتراض فرمایا ہے : " کہ اگر نوٹ حقیقی طور پر مال نہیں تو پھر ان پر زکوٰۃ عائد نہیں ہونی چاہیئے ۔ حالانکہ یہ رائے کسی کی بھی نہیں ہے " ۔ اس کا مختصر جواب یہ کہ نوٹوں پر زکوٰۃ اس وجہ سے عائد ہوتی ہے کہ وہ مجازی طور پر مال ہیں یعنی معاشرے نے حکومت کے ذریعے ان کو ایسی چیزوں کے حصول کا ذریعہ تسلیم کر لیا ہے جو حقیقی طور پر اور بذات خود مال ہیں چنانچہ جب تک ان کی یہ حیثیت قائم رہتی ہے وہ حکماً اور مجازاً مال رہتے ہیں لیکن جب کوئی حکومت اپنے جاری کردہ نوٹوں کو منسوخ کر دیتی ہے اور بازار میں ان کو کوئی نہیں لیتا اور ان کے عوض کوئی چیز نہیں دیتا تو وہ مجازی طور پر بھی مال نہیں رہتے جبکہ اس کے مقابلہ میں سونے چاندی کے سکوں کا حال یہ ہے کہ حکومت ان کو منسوخ کردے جب بھی وہ مال رہتے ہیں چنانچہ ان کے مالک کو ان کے عوض ضروریات زندگی ملتی ہیں کیونکہ سونا چاندی بذات خود مال ہے چنانچہ اگر ان کا وزن اتنا ہو جتنا وجوب زکوٰۃ کیلئے مقرر ہے تو ان پر زکوٰۃ بھی ضرور عائد ہوتی ہے ۔

میری عبارت کے جس دوسرے جزو پر اعتراض کیا گیا ہے وہ یہ ہے : " دنیا میں افراط زر کا اصل سبب کاغذی کرنسی کا رواج ہے ۔ اس کے ختم ہوئے بغیر انسانیت کو افراط زر کی مصیبت سے چھٹکارا ملنا مشکل ہے ۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک بارٹر سسٹم کے تحت اجناس کا تبادلہ جناس سے ہوتا تھا یا جب تک رائج الوقت سکے سونے چاندی کے ہوتے تھے کبھی افراط زر کا مسئلہ اس طرح پیدا نہیں ہوا " اعتراض اس عبارت پر ان الفاظ سے فرمایا گیا ہے وہ یہ ہیں " کہ یہ رائے کہ افراط زر کا علاج زر کاغذی سے دوبارہ دھاتوں کے زر یا بارٹر سسٹم کی طرف پلٹنا محل نظر ہے ۔ اس کی حمایت میں پوری دنیا میں ایک رائے بھی نہیں ہے نہ کسی تجربے کے ذریعے اسے ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی پوری دنیا میں اس پر کوئی عمل کرنے کو تیار ہوگا ۔ ایسا علاج خواہ اسلام کے نام پر پیش کیا جائے یا منطق کے زور پر کوئی حیثیت نہیں رکھتا " اس اشکال یا اعتراض کا جواب یہ کہ پہلے تو یہ دعویٰ ہی خلاف واقعہ اور غلط ہے کہ اس رائے کی حمایت میں پوری دنیا میں ایک رائے بھی نہیں ہے ۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر اس مسئلہ پر کب دنیائے انسانیت میں استصواب رائے ہوا تھا اور کب

مختلف مدرسہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے معاشی مفکرین اور اصحاب رائے نے اس کے خلاف متفقہ فیصلہ دیا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ ایک رائے بھی اس کی حمایت میں نہیں، یہ دعوی اس لئے بھی غلط ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا انسان اور نظریہ نہیں جس کے متعلق موافق اور مخالف یکسر رائے نہ پائی جاتی ہوں اور پھر جناب کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ پوری دنیا میں اس پر کوئی عمل کرنے کو تیار نہیں' اس بات کی تردید کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ جس انسانیت نے ہزاروں سال سونے چاندی کے سکوں اور اجناس کے بدلے اجناس کے نظام پر عمل کیا وہ آج بھی اس کو اپنا سکتی ہے اس پر عمل کر سکتی ہے اور اس کا قابل عمل ہونا موجودہ حالات میں بھی ناممکن اور محال نہیں' کیا بعید کہ ٹھوکریں کھانے اور تلخ تجربات کے بعد انسانیت پھر اس طرف لوٹ جائے اور پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ آج بھی سوشلسٹ ممالک اور غیر سوشلسٹ ممالک کے مابین تجارتی لین دین اشیاء کے بدلے اشیاء سے ہو رہا ہے ! پاکستان اور روس کے درمیان آج اسی طریقہ سے تجارتی لین دین ہو رہا ہے جس کا نام بارٹر سسٹم ہے اور پھر جو چیز چھوٹے اور محدود پیمانے پر اختیار کی جا سکتی ہو بڑے اور وسیع پیمانے پر کیوں اختیار نہیں کی جا سکتی۔ غرضیکہ یہ کہنا نہ نقل کی رُو سے صحیح ہے اور نہ عقل کی رو سے صحیح کہ سونے اور چاندی کی کرنسی اور اشیاء کے بدلے اشیاء کے نظام پر پوری دنیا میں کوئی بھی عمل کرنے کو تیار نہیں۔ اگر دعوٰی مذکور کو تھوڑی دیر کے لئے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے یعنی یہ کہ انسانیت اب کاغذی کرنسی کو چھوڑنے اور دھاتی سکوں اور اشیاء کے بدلے اشیاء کے نظام کو دوبارہ قبول کرنے کو تیار نہیں تو اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ کاغذی کرنسی کو چھوڑنے اور سونے چاندی کی کرنسی اور بارٹر سسٹم کو اختیار کرنے کی رائے ہی غلط ہے ؟ اگر کسی چیز کے صحیح و غلط اور حق و باطل کا معیار یہ قرار دیا جائے کہ انسانیت اس کو مانتی اور اس پر عمل کرتی ہے یا نہیں تو پھر بہت سی صحیح اور حق چیزوں کو غلط و باطل اور بہت سی غلط و باطل چیزوں کو صحیح اور حق ماننا اور کہنا پڑے گا اور نیکیوں اور بدیوں کا پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا معیار مذکور غلط اور باطل ہے اور اس پر مبنی استدلال بھی غلط و نادرست جس کی علمی طور پر کوئی حیثیت نہیں۔

تیسرے اور چوتھے استدلال کا تعلق میری اس عبارت سے ہے جو میں نے افراطِ زر کے اسباب کے بارے میں لکھی تھی اور دین و شریعت کے حوالے سے نہیں بلکہ عام مطالعے اور آزاد سوچ کے تعلق سے لکھی تھی، چونکہ بعض کتابوں میں افراطِ زر کے اسباب میں سے ایک سبب حکومت کا مقرر مقدار سے زیادہ نوٹ چھاپنا اور ان کا گردش کرنا بھی لکھا ہے۔ لہٰذا جعلی نوٹوں کے چھپنے اور پھیلنے سے افراطِ زر میں اضافہ ہونا ایک قابلِ فہم بات ہے۔

پھر آگے اکرم خان صاحب نے اعتراض کے لئے میری وہ عبارت نقل فرمائی ہے جو کرنسی نوٹوں کے قرضہ سے متعلق تھی اور میں نے ان کے ایک اعتراض کے جواب میں لکھی تھی، جس کا حاصل یہ کہ چونکہ کرنسی نوٹ فی نفسہٖ اور بذاتِ خود مال نہیں بلکہ اس حیثیت سے مال ہیں کہ حکومت اور معاشرے نے ان

کو حقیقی اموال کے حصول اور تبادلے کا ذریعہ تسلیم کر لیا ہے۔ لہٰذا ان کے قرضہ کے لین دین میں ان کی اس حیثیت کو ملحوظ رکھنا شرعاً اور عقلاً ضروری ہے اور یہ کہ اس کے ملحوظ رکھنے کی صورت یہ ہے کہ ان کے قرض میں ان کی تعداد کی بجائے کسی حقیقی مال اور جنس کی مقدار کو قرض قرار دیا جائے جو بوقت قرض ان نوٹوں سے مل سکتی تھی اور پھر ادائیگی اس حقیقی مال کی مقدار کے مطابق ہو۔ فرض کیجئے کہ اگر ادائیگی کے وقت بھی نوٹوں کی اسی تعداد سے اتنا ہی حقیقی مال اب بھی بازار سے مل سکتا ہے جتنا بوقت قرض ملتا تھا تو اتنے ہی نوٹوں سے ادائیگی کی جائے گی، اور اگر بوقت ادائیگی نوٹوں کی اس تعداد کے عوض اتنا حقیقی مال نہیں ملتا بلکہ اس تعداد سے کم یا زیادہ کے عوض ملتا ہے تو نوٹوں کی ادائیگی اس کے مطابق کی جائے گی، مثلاً اگر بوقت قرض سو روپے کے نوٹوں کے عوض ایک من گندم ملتی تھی اور بوقت ادائیگی بھی ایک ہی من ملتی ہے تو ادائیگی ٹھیک سو روپے کے نوٹوں سے ہوگی اور اگر بوقت ادائیگی ایک من گندم کی قیمت نوّے روپے ہوگئی یا ایک سو دس روپے ہوگئی تو پہلی صورت میں ادائیگی نوّے روپے کے نوٹوں سے اور دوسری صورت میں ایک سو دس روپے کے نوٹوں سے ہوگی کیونکہ قرض میں یہ شرعاً لازم ہوتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد قرض میں لئے ہوئے مال کی مثل ادا کی جائے، اگر مال بذاتہٖ اور بنفسہٖ مال ہو تو اس کی مثل عدد اور وزن کی برابری سے ہوگی اور اگر مال بنفسہٖ اور بذاتہٖ حقیقی طور پر مال نہیں بلکہ حصول مال کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے اضافی اور مجازی طور پر مال ہے تو اس کی مثل کا تعین اس کی اپنی تعداد و مقدار کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس حقیقی مال کی تعداد اور مقدار کی برابری کے لحاظ سے ہوگا جس کے حصول کا وہ ذریعہ و وسیلہ ہے، کرنسی نوٹ بھی چونکہ حقیقی مال نہیں بلکہ اضافی اور مجازی طور پر مال ہیں لہٰذا ادائیگی قرض میں ان کی مثل کا تعین کسی حقیقی مال کی تعداد و مقدار سے ہونا ضروری ہے چنانچہ مثالِ مذکور میں ادائیگی قرض کی جو تین شکلیں ذکر ہوئی ہیں تینوں اس وجہ سے درست ہیں کہ ان میں سے ہر شکل میں مثل اور برابری موجود ہے جو ادائیگی میں ضروری ہے۔

میری اس عبارت کو رد کرنے کے لئے جناب محمد اکرم صاحب نے تین اعتراض فرمائے ہیں۔ پہلا یہ کہ "یہ بات متنازع فیہ شکل اختیار کر سکتی ہے کہ کسی وقت حقیقی مال کیا ہو۔ بیسیوں اشیاء میں سے کس چیز کو آپ معیار کے طور پر اختیار کریں گے" الخ۔ اس کا جواب میری طرف سے یہ کہ بوقت قرض دونوں فریق باہمی رضامندی سے جس چیز کو بھی معیار بنالیں وہی معیار بن سکتا ہے اس صورت سے ظاہر ہے کہ بوقت ادائیگی کوئی نزاع نہیں ہو سکتا، دوسرا جواب یہ کہ کسی ایسی چیز کو معیار بنایا جا سکتا ہے جو ملکی اور قومی معیشت میں بنیادی حیثیت رکھتی ہو جیسے زرعی ملک میں غلّہ یعنی گیہوں اور چاول وغیرہ۔ تیسرا جواب یہ کہ سونے چاندی کو معیار بنایا جا سکتا ہے جو ماضی میں طویل زمانے تک ہر متمدن معاشرے میں معیار رہا حتّٰی کہ کچھ زمانہ پہلے تک ہر حکومت صرف اتنے کرنسی نوٹ چھاپنے کی پابند تھی جتنا اس کے پاس محفوظ سونا ہوتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد یہ پابندی ختم ہوئی اور اسلام نے بھی سونے

چاندی کو معیارِ قیمت کیا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ کہ اس وقت دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی اپنی قدر و قیمت یکساں رہتی ہو حتیٰ کہ سونا بھی روز گھٹتا بڑھتا ہے۔ پھر ایسی چیز جو خود یکساں قدر و قیمت کی مالک نہ ہو مذکورہ بالا صورت میں قدر و قیمت کا معیار کیسے قرار دی جاسکتی ہے؟

اس کا جواب یہ کہ اصل مسئلہ جو زیرِ بحث ہے وہ یہ کہ کچھ عرصہ سے کرنسی نوٹوں کی قیمت مسلسل کم ہو رہی ہے مطلب یہ کہ مثلاً ایک سال پہلے سو روپے کے نوٹ کے عوض بازار سے جو مال اور سامان ضرورت مل جاتا تھا آج اسی کے عوض آدھا پونا ملتا ہے۔ لہٰذا اگر کرنسی نوٹوں کے قرضہ میں یہ ضروری ٹھہرایا جائے کہ آج جتنی تعداد میں نوٹ قرض لئے دیئے گئے ایک سال بعد ٹھیک اتنی ہی تعداد میں ان کی ادائیگی ہونی چاہئے تو اس سے قرض دینے والے کی حق تلفی ہوتی ہے اور اسلام کے نزدیک جس طرح یہ حرام ہے کہ مقرض اپنے اصل مال پر مقروض سے کچھ بھی زائد لے اسی طرح یہ بھی حرام ہے کہ مقروض اصل مال کی ادائیگی میں کچھ بھی کمی کرے۔ قرآن مجید کی آیت لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ کا باتفاق یہی مطلب ہے۔ ایسی صورت میں نوٹوں کے قرض کی وہ شکل کیا ہو سکتی ہے جو اسلامی عدل کے مطابق ہو اور جس میں کسی فریق کی حق تلفی نہ ہوتی ہو اور قرض دینے والے کو مقررہ میعاد کے بعد اس کا دیا ہوا مال پورا واپس ملتا ہو؟ اس مسئلہ کا جو جواب میں نے دیا ہے اگر وہ کسی کے نزدیک غلط ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کا دوسرا حل پیش کرے جو دلائل کے لحاظ سے صحیح ہو لیکن یہ کہ اس کا انکار بھی نہ کرنا اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اس میں کیڑے نکالنا اور الٹے سیدھے سوالات و اعتراضات کرنا سمجھ میں نہیں آتا کہ تحقیقِ حق کا کونسا طریقہ ہے اور اس سے اصل مقصد کیا ہے؟

بہرحال میں نے مسئلہ مذکورہ کا جو حل پیش کیا ہے اس میں اس کی پوری وضاحت ہے کہ بوقت قرض اگر مثلاً سو روپے کے نوٹوں کے عوض ایک من گندم ملتی تھی تو ایک من گندم کو قرض متصور کیا جائے گا اور جب ادائیگی قرض کا وقت آئے تو اس کی ادائیگی اتنے روپوں کے نوٹوں سے کی جائے گی جن کے عوض اس وقت ایک من گندم مل سکتی ہوگی۔ فرض کیجئے اگر اس وقت بھی بازار میں ایک من گندم کی قیمت سو ہی روپے ہو تو ادائیگی سو روپے سے اور نرخ گر جانے کی وجہ سے نوّے روپے ہو تو ادائیگی نوّے روپے سے اور نرخ چڑھ جانے کی وجہ سے ایک سو دس روپے ہو تو ادائیگی ایک سو دس روپے کے نوٹوں سے ہوگی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ میں بھی اس حقیقت کو جانتا اور مانتا ہوں جو جناب محمد اکرم صاحب نے اپنے اعتراض میں لکھی ہے یعنی یہ کہ اشیاء و اجناس کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ جب ہی تو میں نے مثال مذکور میں ادائیگی کی ایک شکل نوّے روپے اور دوسری شکل ایک سو دس روپے لکھی ہے۔ پہلی شکل گندم کی قیمت گھٹنے کی اور دوسری شکل قیمت بڑھنے کی وجہ سے ہے۔

چونکہ میرے تجویز کردہ حل کا تعلق کسی حقیقی مال کی اس مقدار سے ہے جو بوقت قرض ان کرنسی

نوٹوں کے عوض مل سکتی تھی جو قرض میں دیئے گئے، اگر مدت قرض میں اس مال کی قدر و قیمت بڑھ جائے یا گھٹ جائے میرے اس حل کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور لین دین میں مشکل اور دقت پیش نہیں آتی، لہٰذا موصوف کا دوسرا اشکال رفع اور اعتراض بے حیثیت ہو کر رہ جاتا ہے۔

البتہ جناب محمد اکرم صاحب کا تیسرا اعتراض بظاہر وزنی اور معقول نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ میرے تجویز کردہ حل کی بعض شکلوں سے ربا الفضل کا جواز لازم آتا ہے اور وہ شکل وہ ہے جس میں مقروض قرضہ میں لئے ہوئے نوٹوں سے زیادہ نوٹ ادا کرتا ہے جیسے مثال مذکور میں تیسری شکل جس کے اندر گندم کا نرخ بڑھ جانے کی وجہ سے ادائیگی میں سو کی بجائے ایک سو دس روپے کے نوٹ تجویز کئے گئے ہیں جبکہ یہ شکل صریح طور پر ربا الفضل ہے جس سے حدیث نبوی میں منع فرمایا گیا گویا یہ حل اس وجہ سے درست نہیں کہ اس سے ایک حرام چیز کا حلال ہونا لازم آتا ہے۔ اس کا جواب یہ کہ ربا الفضل کا تعلق ایسی اشیاء کی بیشی سے ہے جو بذاتِ خود اور حقیقی طور پر مال ہوتی ہیں، اس کی دلیل یہ کہ جس حدیث نبوی سے ربا الفضل کا ممنوع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس میں جن چھ اشیاء کا ذکر ہے وہ سونا، چاندی، گیہوں، جَو، کھجور اور نمک ہیں اور یہ سب چیزیں بذاتِ خود اور حقیقی طور پر مال ہیں اور کرنسی نوٹ جیسا کہ پہلے بار بار عرض کیا گیا بذاتِ خود اور حقیقی طور پر مال نہیں لہٰذا قرض کی مذکورہ شکل میں ان کی کمی بیشی ربا الفضل کی تعریف میں نہیں آتی جس سے حدیثِ نبوی میں منع فرمایا گیا ہے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا پہلے سوال کے متعدد مندرجات سے متعلق تھا اب میں جناب محمد اکرم خان کے دوسرے سوال کی طرف آتا ہوں جسے پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک لکھے پڑھے سمجھدار شخص نے ایسا سطحی اور فضول سوال کیسے کر دیا، اس میں ایک انسان کی عملی و پیداواری صلاحیتوں پر زمین کی قدرتی پیداواری صلاحیتوں کو جو قیاس کیا گیا ہے اپنی نوعیت کا عجیب و غریب اور بڑا دلچسپ قیاس ہے، کہاں ایک زمین کی وہ قدرتی پیداواری صلاحیتیں جو کسی انسان کی سعی و محنت سے نہیں بلکہ قدرتی اسباب و عوامل کے زیر اثر وجود میں آتی اور خالق کائنات کی طرف سے بنی نوع انسان کے لئے عطیہ عام کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن سے متمتع ہونے اور فائدہ اٹھانے کا حق اللہ رب العلمین نے سب انسانوں کو یکساں طور پر عطا فرمایا ہے، قرآنی آیت ہے: هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وہ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے انتفاع کے لئے زمین کی سب چیزوں کو پیدا فرمایا۔ اس آیت مبارکہ سے صاف ظاہر ہے کہ زمین کے اندر باہر جتنی بھی اشیاء ہیں اللہ رب العزت نے بنی نوع انسان کے استفادہ کے لئے پیدا فرمائی ہیں۔ اور کہاں ایک انسان کی وہ عملی اور پیداواری صلاحیتیں جو بیشمار انسانوں کی اختیاری کوششوں اور محنتوں سے وجود میں آتی، نشوونما پاتی اور پروان چڑھتی ہیں اور جن کے وجود میں خود اس انسان کی ارادی و غیر ارادی کوششوں و کاوشوں کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے، اگر

والدین اور خاندان کے دیگر افراد بچے کی پرورش و تربیت اور دیکھ بھال نہ کریں، معاشرے کے دوسرے لوگ وہ گوناگوں چیزیں پیدا اور مہیا نہ کریں جن پر انسان کی حیات و بقا اور نشوونما کا دارومدار ہے اور خود وہ انسان اپنی جان اور صحت وغیرہ کا خیال نہ رکھے مفید چیزیں حاصل کرکے اپنے استعمال میں نہ لائے اور مضر چیزوں سے نہ بچے تو پیداواری صلاحیتیں اور قوتیں تو درکنار انسان کا وجود ہی قائم نہیں رہ سکتا اور وہ ہلاکت کا شکار ہو جاتا ہے۔

غرضیکہ انسان کی پیداواری صلاحیتیں بڑی حد تک کسبی اور اختیاری ہوتی ہیں غالباً اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جو ہر شے کا حقیقی خالق و مالک ہے۔ ہر انسان کو ان عملی اور پیداواری صلاحیتوں کا مالک ٹھہرایا اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج و ثمرات اسی کے انتفاع و استفادہ کے لئے مخصوص فرمائے ہیں حتیٰ کہ دوسرا کوئی اس کی رضامندی اور اجازت کے بغیر ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ قرآن مجید کی متعدد آیات سے اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے جو عقل و فطرت اور عدل و انصاف کے عین مطابق ہے، بتلائیے اتنا واضح اور روشن فرق موجود ہوتے ہوئے زمین کی قدرتی پیداواری صلاحیتوں کو انسان کی پیداواری صلاحیتوں پر قیاس کرنا، قیاس کا جھٹکا کرنا نہیں تو اور کیا ہے اور پھر اس قیاس کی بنیاد پر یہ کہنا کہ جب انسان کی پیداواری صلاحیتوں کا معاوضہ لینا جائز ہے تو پھر زمین کی پیداواری صلاحیتوں کا معاوضہ کیوں جائز نہ ہو، بناء الفاسد علی الفاسد اور مضحکہ خیز بات ہے اور پھر یہ لکھنا کہ مولانا کے پاس ان میں فرق کرنے کے کون سے دلائل ہیں؟ اس کا جواب سطورِ بالا میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ کہ زمین کی پیداواری صلاحیتیں قدرتی اور بنی نوع انسان کے استفادہ کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور ان سے ہر وہ انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے جو پیداوار کے لئے زمین کاشت کرتا ہے جبکہ اس کے بالمقابل انسان کی پیداواری صلاحیتیں اور قوتیں بڑی حد تک کسبی ہیں اور ارشادِ خداوندی کے مطابق ہر انسان کی پیداواری صلاحیتیں خود اس کے استفادہ کے لئے اور ان کے ثمرات کا خود وہ انسان مالک و حقدار ہے، اس کی رضا و خوشی کے بغیر کسی دوسرے انسان کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان سے فائدہ اٹھائے

جناب محمد اکرم خانصاحب کا تیسرا سوال جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے میری اس تحریر سے متعلق ہے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ عامل پیدائش دولت، سرمایہ نہیں صرف محنت ہے .... الخ۔ اس پر موصوف نے پہلا اعتراض ان الفاظ سے فرمایا: "مولانا بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سرمایہ اصل میں ماضی کی محنت ہی ہے جو کہ سرمائے کی شکل میں جمع ہو گئی ہے، اس صورت میں سرمائے کا معاوضہ نہ ہونا عقل کے خلاف ہے کیونکہ سرمایہ کچھ نہیں ہے سوائے جمع شدہ محنت کے اور محنت کے معاوضہ کے مولانا خود قائل ہیں۔ لہٰذا سرمائے کے معاوضے کی مخالفت سمجھ میں نہیں آتی۔"

اس کا جواب یہ کہ مجھے افسوس ہے کہ جناب اکرم خانصاحب نے میری تحریر غور کے ساتھ پڑھنے اور توجہ کے ساتھ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں فرمائی ورنہ وہ کبھی ایسی بات نہ لکھتے، میں نے سرمائے کی ماہیت کے متعلق کہیں یہ نہیں لکھا کہ سرمایہ اصل میں ماضی کی محنت ہی ہے جو کہ سرمائے کی شکل میں جمع ہوگئی ہے بلکہ یہ لکھا ہے دوبارہ دیکھ لیجئے کہ اصطلاح میں جس قابل معاوضہ قیمتی چیز کو ایک اعتبار سے دولت اور دوسرے اعتبار سے سرمایہ کہا جاتا ہے تجزیہ کرکے دیکھا جائے تو وہ دو چیزوں سے مرکب نظر آتی ہے ایک کوئی قدرتی مادہ اور دوم انسانی محنت کے مفید اثرات الخ دراصل موصوف محنت اور اثرات محنت کو نہیں سمجھ پائے، محنت کا تعلق ایک زندہ انسان کی اس دماغی وجسمانی حرکت سے ہے جو کسی معاشی فائدے کے لئے کی جاتی ہے اور اثرات محنت ان فائدوں کا نام ہے جو محنت سے وجود میں آتے اور مادی اشیاء کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں وہ مردہ و بے جان ہونے کی وجہ سے کسی نئی شے کو پیدا نہیں کر سکتے۔ البتہ بعض صورتوں میں جب سرمایہ استعمال ہوتا ہے تو یہ اثرات تحلیل ہو کر نئی محنت کے اثرات میں شامل ہو جاتے اور ان کا حجم بڑھا دیتے ہیں، محنت بہر حال ایک زندہ انسان کے ساتھ قائم رہتی ہے وہ کسی سرمائے وغیرہ میں منتقل نہیں ہوتی جو چیز منتقل ہوتی ہے اس کے اثرات و نتائج ہوتے ہیں جو مادی اشیاء میں مختلف تغیرات و تبدلات کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور یہ تغیرات و تبدلات اپنے وجود کو جوں کا توں برقرار رکھتے ہوئے کسی نئی چیز کے وجود کا باعث نہیں بنتے اور کسی نئی شے کو پیدا نہیں کر سکتے لہٰذا عقل و سمجھ کا تقاضا یہ ہے کہ سرمائے کو نہ عامل پیداوار تسلیم کیا جائے اور نہ عامل کی حیثیت سے اس کا کوئی معاوضہ قرار دیا جائے۔ البتہ استعمال سے اس کی قدر و قیمت اور مالیت میں جو کمی واقع ہو پیداوار میں سے اس کی ضرور تلافی کی جائے۔ اس کے بعد جناب محمد اکرم خانصاحب کا دوسرا اعتراض جو متعدد ضمنی مباحث پر مشتمل دو صفحوں میں پھیلا ہوا ہے اس میں انہوں نے میری اس بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے جو میں نے عوامل پیدائش دولت کے متعلق لکھی تھی یعنی یہ کہ اس بارے میں دنیائے معاشیات کے اندر دو تصور پائے جاتے ہیں: ایک یہ کہ محنت اور سرمایہ دونوں دولت کو پیدا کرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ صرف محنت ہی سے دولت پیدا ہوتی ہے۔ سرمایہ اسے پیدا نہیں کرتا اور یہ کہ میں پہلے تصور کو غلط اور دوسرے کو صحیح اور مطابق اسلام سمجھتا ہوں اور میں دلائل کی بنیاد پر ایسا سمجھتا ہوں وہ یہ ہیں، اب اگر اکرم صاحب کے نزدیک میری بات غلط تھی جو دوسرے تصور پر مبنی تھی اور انہیں اسے غلط ثابت کرنا تھا تو اس کا صحیح علمی طریقہ یہ تھا کہ وہ ایسے نقلی و عقلی مثبت دلائل پیش فرماتے جن سے پہلے تصور کا صحیح اور دوسرے کا غلط ہونا ثابت ہوتا۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اس کی بجائے غیر علمی، محض تنقیدی اور منفی طریقہ اختیار کیا جس کا نتیجہ سوائے الجھاؤ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں: "دوم، مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ

سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ و محنت کی تمام کشمکش اس وجہ سے ہے کہ فریقین کا حصہ طے کرنے کا کوئی دائمی اور عادلانہ فارمولا نظام میں نہیں ہے۔"

یہ میری ایک طویل عبارت کا ایک ٹکڑا ہے جو میں نے سرمایہ کے عاملِ پیداوار نہ ہونے کے استدلال میں لکھی تھی۔ قارئین حکمتِ قرآن میں سے جن حضرات کو اس بحث سے دلچسپی ہو براہ کرم ایک مرتبہ پھر میری اس تحریر کو دیکھنے کی زحمت فرمائیں جس سے یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے، میں نے اس عبارت میں جو بات کہی ہے اسے رد کرنے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ موصوف کوئی سائنٹفک فارمولا پیش کرتے جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ کسی کاروبار سے جو مال پیدا ہوتا ہے اس کا اتنا حصہ محنت سے اور اتنا سرمائے سے وجود میں آتا ہے۔ ایسا فارمولا سامنے آنے سے میری بات یقیناً رد ہو جاتی، لیکن موصوف نے بجائے اس کے لفظ اسلام کا غلط استعمال بلکہ استحصال شروع کر دیا، غلط استعمال اور استحصال کے الفاظ میں نے اس لئے لکھے ہیں کہ اگر موصوف اس بارے میں قرآن و حدیث کی کوئی نص یا کسی صحابی، تابعی، امام و مجتہد کا کوئی ایسا قول پیش کرتے جس سے یہ ثابت ہوتا کہ محنت کی طرح سرمایہ بھی دولت کو پیدا کرتا اور پیدا شدہ دولت میں اس کا اتنا دخل اور حصہ ہوتا ہے تو اسلام کا صحیح استعمال ہوتا لیکن انہوں نے بجائے اس کے یہ لکھا کہ "فرض کیجئے ایک شخص اپنے سرمائے اور محنت سے کاروبار کر رہا ہے وہ اپنے ساتھ کسی دوسرے شخص کو شریک کر لیتا ہے جو صرف محنت کر سکتا ہے اور اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے۔ فرض کیجئے دونوں ایک ہی صلاحیت کے انسان ہیں اور یکساں اوقات کام کرتے ہیں۔ اسلامی نظام میں ان کے درمیان منافع کی تقسیم کیسے ہوگی؟ ایک صورت یہ ہے کہ دوسرا شخص ملازم ہو۔ اس صورت میں بھی چونکہ پہلا شخص اور دوسرا شخص برابر کی محنت کر رہے ہیں، مولانا کے انصاف کی رُو سے دونوں کو برابر برابر حصہ ملنا چاہیئے (چونکہ سرمایہ تو عاملِ پیدائش ہی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ پہلا شخص سرمائے کی فرسودگی مزید لے سکتا ہے۔ کیا مولانا کے نزدیک یہی صورت تقسیم منافع کی ہوگی یا کوئی دوسری؟ اور اگر یہی ہوگی تو کسی بھی غیر جانبدار معقول آدمی سے پوچھ لیں کہ کیا یہ انصاف ہوگا؟ شریعت کے معیار کی بات تو بہت دور کی ہے عقلِ سلیم بھی اسے تسلیم نہیں کرے گی۔"

اس عبارت میں صورتِ مذکورہ کے متعلق مجھ سے جو سوال پوچھا گیا ہے، اس کا جواب یہ کم از کم تیس سالہ قرآن و حدیث کے مطالعے اور غور و فکر سے اسلام کے معاشی عدل و انصاف کا جو تصور میری سمجھ میں آیا ہے اور جس پر اسلام کا حقیقی اور مثالی معاشی نظام مبنی ہے اس کے مطابق میں پورے وثوق و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ صورتِ مذکور میں دونوں شخصوں کو منافع کا برابر برابر حصہ ملنا چاہیئے۔ سرمائے والے کو کچھ بھی زائد نہیں ملنا چاہیئے سوائے اس کے جو اس میں سے فرسودگی وغیرہ سے کمی واقع ہوئی ہو۔ جو شخص اس کو غلط سمجھے اور ماننے کیلئے تیار نہ ہو میرے نزدیک

نہ وہ غیر جانب دار ہے اور نہ معقول اور نہ اس کا تصورِ عدل و انصاف درست ہے کیونکہ اگر غیر جانبدار سے مراد وہ انسان ہے جو کسی مذہب و ملت اور کسی نظام و ازم سے تعلق نہ رکھتا اور سب کو یکساں و برابر سمجھتا ہو تو ایسا غیر جانب دار آدمی اس دنیا میں کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ اور اگر کوئی مل گیا تو اس کی بات ماننا تو درکنار کوئی اسے معقول آدمی سمجھ کر اس کی طرف دھیان بھی نہیں دے گا۔ اور اگر غیر جانبدار سے اکرم صاحب کی مراد غیر علم ہے تو پھر انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس دنیا میں نہ صرف یہ کہ سوشلسٹ ممالک میں بلکہ غیر سوشلسٹ اور کیپٹلسٹ ممالک میں بھی کروڑہا انسان ایسے موجود ہیں جو میرے جواب مذکور کو صحیح و درست سمجھتے ہیں کیونکہ سوشلزم کے بنیادی تصورات میں سے ایک تصور یہ ہے کہ عاملِ پیدائش دولت صرف محنت ہے ——— سرمایہ نہیں اور وہ کروڑہا انسان اس تصور اور اس پر مبنی بات کو عدل و انصاف اور عقلِ سلیم کے مطابق باور کرتے ہیں۔ البتہ وہ لوگ اس تصور کو ضرور غلط سمجھتے اور اس پر مبنی بات کا ضرور انکار کرتے ہیں جو نظامِ سرمایہ داری پر ایمان رکھتے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسلام کا معاشی نظام بھی بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ آخر میں جناب اکرم صاحب نے جو تحریر فرمایا ہے کہ شریعت کے معیار کی بات تو بہت دور کی ہے عقلِ سلیم بھی اسے تسلیم نہیں کرے گی۔ اس کے متعلق میں موصوف سے پوچھ سکتا ہوں کہ اس بارے میں قرآن و حدیث کے اندر شریعت کا وہ معیار کیا ہے جس کی وہ بات کر رہے ہیں؟ نیز یہ کہ عقلِ سلیم کی وہ مسلمہ تعریف کیا ہے جسے ہر انسان مانتا اور صحیح سمجھتا ہو؟ اور کیا یہ واقعہ نہیں کہ دنیا میں متضاد مذاہب اور نظاموں کو ماننے والے اپنے اپنے دین و مذہب اور نظام و ازم کو عقلِ سلیم اور انصاف کے مطابق سمجھتے اور کہتے ہیں اور کوئی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس کا اختیار کردہ دین و نظام عقلِ سلیم اور عدل و انصاف کے خلاف ہے۔

اس سے آگے موصوف نے یہ جو کہا ہے کہ "خود معاشی قوتیں اتنی مضبوط و طاقتور ہیں کہ وہ اس طرح کے انصاف کو ہوا میں تحلیل کر دیں گی"۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ لکھنے والے کے ذہن و دماغ پر سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی طرح چھایا ہوا ہے جس کی بنیاد ہی اس تصور پر قائم ہے کہ سرمایہ بھی دولت کو پیدا کرتا ہے لہٰذا وہ ایسے انصاف کو کیسے برداشت کر سکتا ہے جس کی بنیاد "تصورِ مذکور کی نفی پر قائم ہو بلکہ اس کے وجود و قیام کے لئے ضروری ہے کہ ایسے انصاف کو ہوا میں تحلیل کر دے"۔ لیکن جو معاشی نظام تصورِ مذکور کو غلط قرار دیتا اور اس کا انکار کرتا ہے اس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ اس انصاف کو مقدس سمجھ کر ہمیشہ قائم و دائم رکھے کیونکہ اس کی نفی سے خود اس کی نفی ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر مطلب یہ کہ موصوف نے جو بات لکھی ہے وہ ایسے ملک و معاشرے کی حد تک درست ہے جس کے لوگ سرمایہ دارانہ معاشی نظام پر ایمان رکھتے اور اسے عملاً اختیار کئے ہوئے ہوں لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید واقعہ ہے کہ اس کے ماننے والوں میں سے لاکھوں بلکہ کروڑوں اب

اسے ظالمانہ اور غیر منصفانہ نظام سمجھ کر اس سے بغاوت کر چکے ہیں۔ سوشلزم اور کمیونزم کے علمبردار وہی لوگ ہیں جو پہلے کیپٹل ازم کو اختیار کئے ہوئے تھے لہٰذا یہ نظام بتدریج روبہ زوال اور رفتہ رفتہ کمزور و مضمحل ہو کر ختم ہو رہا ہے۔ سرمایہ دار اسے مصنوعی طریقوں سے سہارا دے کر اسے قائم رکھنے کی کوششیں کر رہے ہیں لیکن اس کی حالت دن بدن ابتر ہو رہی ہے اس لئے کہ اس کی بنیاد حق تلفی اور ظلم پر ہے اور ظلم کسی وقت تک تو قائم رہ سکتا ہے لیکن ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا اور چونکہ اس کے خمیر میں سود کا جواز موجود ہے لہٰذا یہ اسلام کے حقیقی معاشی نظام کی ضد و نقیض ہے جو سود کو کلی طور پر حرام و ناجائز ٹھہراتا ہے۔ اسلام کے معاشی نظام کے متعلق کچھ سطحی ذہن اور سرسری علم رکھنے والوں کا یہ خیال کہ بنیادی طور پر یہ سرمایہ دارانہ نظام ہے قطعی غلط و باطل خیال ہے۔ اور اسلام پر کھلا ہوا افترا ہے۔

پھر آگے میری بات کو غلط ثابت کرنے کے لئے کہ "معاوضہ کا حق صرف محنت کو ہے" لکھتے ہیں:

"خود مولانا تسلیم کرتے ہیں کہ اس نظریہ کے سب سے بڑے علمبردار اشتراکی ممالک بھی اس پر عمل نہ کر سکے۔" حالانکہ یہ بات غلط ہے کیونکہ میں نے جو بات تسلیم کی اور لکھی ہے وہ اس طرح ہے: اشتراکی نظام اصولی طور پر سرمائے کے عامل پیداوار ہونے کا انکار کرتا اور صرف محنت کو عامل پیداوار قرار دیتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ کوئی اشتراکی معاشرہ اس اصول پر عمل کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا ..... الخ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف اپنی مطلب برآری کے لئے دوسرے کی طرف غلط بات منسوب کرنے میں بھی کچھ حرج نہیں سمجھتے ورنہ کون نہیں جانتا کہ کسی نظریئے و اصول پر عمل نہ کر سکنے اور پوری طرح نہ کر سکنے کے درمیان کتنا بڑا اور بین فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ کامل طور پر عمل کی نفی سے مطلق عمل کی نفی نہیں ہوتی اور پھر جب کہ اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے نزدیک اس پر پوری طرح عمل نہ کر سکنے کا سبب وہ عالمی حالات ہیں جو بقول ان کے سرمایہ داروں کے پیدا کردہ ہیں جہاں تک اس نظریئے کے صحیح اور قابل عمل ہونے کا تعلق ہے یقینی طور پر ان کے نزدیک صحیح اور قابل عمل ہے پھر چونکہ یہ واقعہ ہے کہ سوشلسٹ ممالک میں پچاس ساٹھ سال سے اس پر عمل ہو رہا ہے۔ اور اس پر مبنی نظام معیشت کامیابی اور حسن و خوبی سے چل رہا ہے نہ انفرادی خوشحالی و ترقی کی راہ میں اس سے کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی ہے اور نہ اجتماعی تعمیر و ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ، لہٰذا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ صرف محنت کے معاوضے کا نظریہ عملی لحاظ سے ناکام ہے۔

اس کے بعد محمد اکرم صاحب نے مجھ سے یہ سوال کرتے ہوئے لکھا ہے: کہ "اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں سے کسی دور یا کسی ملک بشمول خلفاء راشدین دکھا دیجئے کہ کہاں یہ بات رائج

رہی ہے کہ معاوضہ کا حق صرف محنت کو رہا ہو؟

میری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری تاریخ اسلامی کے دو حصے ہیں ایک وہ جس کا تعلق عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ سے ہے اور دوسرا وہ جس کا تعلق خلافت کے بعد کے ادوار سے ہے۔ جو حصہ عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ سے تعلق رکھتا ہے، دینی امور میں اس کا ضرور اعتبار ہے کیونکہ وہ سنت رسول اور سنت خلفاء راشدین پر مبنی و مشتمل ہے جو کتاب اللہ کے ساتھ شریعت اسلامی کا دوسرا ماخذ ہے، لیکن ہماری تاریخ کا وہ حصہ جو خلافت راشدہ کے بعد کے ادوار اور زمانوں سے تعلق رکھتا ہے دینی امور و مسائل کے تعین میں اس کا کوئی اعتبار نہیں اس لیے کہ خلافت راشدہ کے بعد جو سیاسی اور حکومتی نظام وجود میں آیا وہ اسلامی سے زیادہ غیر اسلامی تھا اور پھر اس کے اندر معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ڈھانچوں نے جو شکلیں اختیار کیں وہ بھی اسلامی سے زیادہ غیر اسلامی تھیں، عرب و عجم کے مختلف ممالک میں جو اسلامی یا مسلمانوں کے معاشرے ظہور میں آئے وہ اس معاشرے سے بہت کچھ مختلف تھے جو عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں صحابہ و تابعین کا معاشرہ تھا، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ کے جو عملی حالات کتب احادیث میں مذکور و محفوظ ہیں جب ان میں سے معاشی حالات کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ تحریم ربا کے اعلان کے بعد اس مبارک عہد میں ایسے معاشی معاملات کا خاتمہ ہو گیا جن میں ایک فریق بغیر کسی محنت و مشقت کے اور بغیر کوئی نقصان برداشت کرنے کے محض اس بنا پر دوسرے فریق کی محنت سے پیدا شدہ مال کے ایک حصے کا حقدار ٹھہرتا تھا کہ محنت کرنے والے نے اس کا سرمایہ استعمال کیا ہے اب جو معاشی صورت حال سامنے آئی وہ یہ کہ کسب معاش کے سلسلہ میں یا تو آدمی خود کام کاج کرتا تھا اور یا اپنے غلاموں سے کام کاج کراتا تھا اگر اس کے غلام ہوتے تھے لہٰذا عملاً سرمائے کے معاوضے کا نظریہ کالعدم ہو گیا تھا۔

جہاں تک خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے جن کا قول و عمل دین اور معیار حق ہے ہمیں احادیث نبویہ کے پورے ذخیرہ میں کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں ملتی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کسی کو اپنا سرمایہ کاروبار کے لئے دیا ہو اور اس سے اس کے بدلے منافع یا پیداوار کا ایک حصہ وصول کیا ہو، یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آپ نے کبھی کسی سے مزارعت کا معاملہ کیا اور نہ مضاربت کا۔ اعلان نبوت سے پہلے آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو کاروباری معاملہ کیا وہ بھی متعین اجرت کا معاملہ تھا مضاربت کا معاملہ نہ تھا، اس کی تفصیل میرے مضاربت والے مقالے میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔ اور اگر بالفرض یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ معاملہ مضاربت کا معاملہ تھا تو وہ رب المال کی حیثیت سے نہ تھا بلکہ عامل مضارب کی حیثیت سے تھا اور ظاہر ہے کہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اسی طرح خلفاء الراشدین کے متعلق بھی ایسی کوئی روایت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ انہوں نے

اپنے عہد میں کسی کو اپنا مال کاروباری مقصد کے لئے دیا اور اس سے نفع کا کچھ حصہ لے لیا ہو۔ بعض روایات سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ صحابہ کرام نے اپنے زیر کفالت یتیموں کا مال مضاربت پر دیا۔ کیوں دیا؟ اس پر مفصل بحث میرے مضاربت والے مضمون میں ملاحظہ فرمائی جائے۔ مطلب یہ کہ عہد رسالت اور عہد خلفاء راشدین میں ایک طرف ربوٰ اور ربوٰ کی قسم کے ربوی معاملات سے اجتناب و امتناع کا پایا جانا جن میں ایک فریق بغیر کسی محنت و مشقت کے اور بغیر کسی نقصان برداشت کرنے کسی ذمہ داری کے محض اپنے سرمائے کے استعمال پر کسی زائد چیز کا حقدار ٹھہرتا تھا اور دوسری طرف ان احادیث نبویہ کے پیش نظر جن میں رزق حلال کے لئے جدوجہد کرنے کو عظیم نیکی اور جہاد فی سبیل اللہ جیسا عمل بتلایا اور بہترین روزی اس کو قرار دیا گیا ہے جو انسان خود اپنے ہاتھ کی محنت سے کماتا کھاتا ہے صحابہ کرامؓ کے اندر خود محنت و مشقت کر کے کمانے کھانے کا عمومی رواج ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس عہد میں محنت کے معاوضے کو صحیح اور سرمائے کے معاوضے کو غلط و ناجائز سمجھا جاتا تھا۔

اس سے آگے موصوف لکھتے ہیں "صرف محنت کو معاوضے کا حقدار مان کر ہم بہت سی پیچیدگیوں کا دروازہ بھی کھولتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں حکومتوں اور کاروباروں کے لئے سرمائے کا ایک بڑا حصہ گھریلو بچتوں کی شکل میں میسر آتا ہے اگر ان بچتوں کو مفید طور پر استعمال کرنے کا موقع چھین لیا جائے تو کون اپنا سرمایہ کاروباروں اور حکومتوں کو دے گا؟ شریعت کی کوئی ایسی تعبیر جس سے آپ انسانیت کو مفید کاموں سے محروم کر دیں کسی دور میں بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ ان بچتوں پر شریعت نے سود کو حرام قرار دیا ہے لیکن اس سے بڑھ کر اسے مضاربت و شرکت کی بنیادوں پر لگانے پر بھی پابندی لگا دی جائے تو اس سے خواہ مخواہ شریعت کا قافیہ تنگ ہو جائے گا، یہ فقہی بحث کہ شرکت کے لئے محنت لازم اور مضاربت ایک مشتبہ شکل ہے، اس عظیم منفعت کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے جو انسانیت کو اس سرمائے کے استعمال سے پہنچ سکتی ہے"

اس عبارت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ ایسے ممالک و معاشروں کی حد تک درست ہے۔ جہاں سرمایہ دارانہ معاشی نظام رائج ہیں بلاشبہ ایسے ممالک و معاشروں میں بڑے پیمانہ کے تجارتی و صنعتی کاروباروں یا اجتماعی تعمیر و ترقی کے حکومتی پلان دیپ وجیکٹ بنکوں کے سرمائے کے بغیر نہیں چل سکتے، اور بنکوں کے سرمایہ کا بڑا حصہ نجی بچتوں کا مرہون منت ہوتا ہے اور نجی بچتیں بنک کے پاس اس صورت میں جمع ہوتی ہیں جب بچت کرنے والوں کے لئے بنک کی طرف سے یہ یقین دہانی ہو کہ ان کا اصل مال بھی اس کے ذمہ پر واجب الادا قرض ہوگا اور ان کو سرمائے کے فیصد کے لحاظ سے سالانہ اتنا فیصد مزید بھی ملتا رہے گا۔ لیکن چونکہ یہ زائد جناب محمد اکرم صاحب کے نزدیک بھی سود ہے جسے اسلام نے حرام و ممنوع ٹھہرایا ہے لہٰذا

اس کو غیر اسلامی اور ناجائز سمجھتے ہیں اور اس میں ان کے اور ہمارے درمیان اتفاق ہے' اس صورت میں ان لوگوں کی طرف سے جو بنک کے سود کو جائز کہتے ہیں ہم دونوں پر بعینہٖ وہی اعتراض کیا جاتا ہے جو عبارت مذکور میں اکرم صاحب نے مجھ پر کیا ہے یعنی اس صورت کو ناجائز کہنا ' انسانیت کو مفید کاموں سے محروم کرنا اور نقصان پہنچانا نیز شریعت کا قافیہ تنگ کرنا ہے' جہاں تک مضاربت کا تعلق ہے میں اسے حرام نہیں بلکہ جائز مع الکراہیت سمجھتا ہوں جس کے مفصل دلائل میں نے اپنے مضاربت والے مضمون میں پیش کئے ہیں' لیکن صریح سود کے متبادل خصوصاً موجودہ ذہنی وخارجی حالات میں مضاربت کی بنیاد پر کاروبار چلانا ضروری گردانتا ہوں بشرطیکہ اس کی جو شرعی حقیقت وماہیت ہے وہ قائم ومحفوظ رہے' لیکن یہ ناقابل انکار واقعہ ہے کہ موجودہ نظام بنکاری میں اسے فٹ کرنے سے اس کی شرعی حقیقت وماہیت قائم ومحفوظ نہیں رہتی بلکہ بنیادی طور پر بدل جاتی اور اس کی جو نئی قابل عمل شکل بنتی ہے وہ ہر لحاظ سے ربٰو کی شکل ہوتی ہے اور جس قباحت وبرائی کی وجہ سے ربٰو کو اسلام نے حرام ٹھہرایا ہے وہ مضاربت کی اس مسخ شدہ شکل میں بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ رہا معاملہ شرکت جو اسلام کی رُو سے قطعی جائز اور بلا کسی کراہت کے درست معاملہ ہے اور آج بڑے پیمانہ کے معاشی کاروبار اس کی بنیاد پر بخوبی چلائے جاسکتے ہیں تو اس کی وہ حقیقت وماہیت جس کے پیش نظر اسلام نے اسے جائز قرار دیا ہے دو چیزوں سے مرکب ہے: ایک ہر شریک معاملہ کا مال ہنر اور اعتبار' اور دوم ہر شریک کا تجارتی وصنعتی کام وعمل' لہٰذا جس معاملے میں ان دو چیزوں میں سے ایک موجود نہ ہو وہ شرعاً شرکت کا معاملہ نہیں ہوسکتا اور اس کا شرعی حکم وہ نہیں ہوگا جو شرکت کے معاملہ کے لئے ہے' کسی عظیم منفعت ومصلحت کی خاطر کسی شرعی لفظ کی شرعی حقیقت کو ہرگز نہیں بدلا جاسکتا' پھر جبکہ وہ منفعت ومصلحت محض مادی و دنیوی اور صرف ان لوگوں کی ہو جو سرمایہ کاری کی صلاحیت رکھتے ہیں' اسلام میں جس منفعت اور مصلحت کا اعتبار ہے اور جس کو اس نے اپنی تعلیمات میں پوری طرح ملحوظ رکھا ہے وہ مادی و روحانی اور دنیوی واُخروی دونوں قسم کی مصلحت ومنفعت ہے۔ نیز تمام انسانوں یا عظیم اکثریت کی منفعت ومصلحت ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس منطق کو صحیح مان لیا جائے کہ کسی بڑی منفعت ومصلحت کی خاطر شرعی الفاظ کی معنوی حقیقت میں ایسا ردّوبدل کیا جاسکتا ہے جو اس منفعت سے مطابقت رکھتا ہو تو پھر ربٰو کی اس تعبیر اور تعریف کو صحیح ماننا پڑے گا جو موجودہ نظام بنکاری اور اس کے سود کو جائز قرار دینے کے لئے بعض حضرات پیش کرتے ہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اس نظام کے ساتھ عظیم منفعت وابستہ اور اس سے بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے حالانکہ اکرم صاحب موصوف اس کو صحیح نہیں مانتے جیسا کہ ان کی عبارتِ مذکور کے اس ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے: "صحیح ہے کہ ان چیزوں پر شریعت نے سود کو حرام قرار دیا ہے"۔ عبارتِ مذکور سے آگے پورے ایک صفحے پر جناب اکرم خاں صاحب نے جو تحریر فرمایا ہے

غور سے دیکھا جائے تو اس کا جواب میرے مذکورہ جوابات میں تسلی بخش طور پر آگیا ہے لہٰذا میں مزید جواب کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

آخر میں ایک خاص بات عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو سامنے ہو تو انسان بہت سی الجھنوں سے بچ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کا جو حقیقی اور مثالی (آئیڈیل) معاشی نظام ہے اُس کے پوری طرح عمل میں آنے کے لئے ایک خاص قسم کے ذہنی اور خارجی ماحول کا وجود ضروری ہے۔ چنانچہ جس معاشرے میں وہ مخصوص ذہنی اور خارجی ماحول پایا جاتا ہو اس میں وہ معاشی نظام پوری طرح عمل میں آ سکتا اور پائیداری کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے اور جہاں نہ ہو وہاں نہ تو وہ کامل طور پر بروئے کار آ سکتا ہے اور نہ پائیداری کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اسلام مسلمانوں سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اسلام کے حقیقی معاشی نظام کو بروئے کار لانے سے پہلے اس خاص طرح کے ذہنی اور خارجی ماحول کو وجود میں لانے کی امکانی کوشش کریں جس کے بغیر وہ معاشی نظام صحیح اور کامل طور پر عمل میں نہیں آ سکتا۔ اور خاص طرح کے ذہنی ماحول سے مراد معاشرے کی عظیم اکثریت کے ذہنوں میں عدل و احسان کے ان احساسات و جذبات کا موجود ہونا ہے جو ایک فرد کو بلا کسی تخصیص و استثنار دوسرے ہر فرد کے حقوق کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے بلکہ اپنے حقوق کا دوسروں کے لئے ایثار کرنے پر ابھارتے اور آمادہ کرتے ہیں اور جو ایمانی عقائد سے وجود میں آتے اور اسلامی عبادات کے ذریعے زندہ و بیدار رہتے ہیں اور خارجی ماحول سے مراد ہے معاشرے کا بنیادی معاشی ضروریات کے لحاظ سے خود کفیل اور سیاسی لحاظ سے آزاد اور خود مختار ہونا کہ اپنے معاملات اپنی مرضی سے طے کر سکے، نیز معاشرتی طور پر اس کے اندر عزت و بڑائی کا معیار مال و دولت اور جاہ و اقتدار کی بجائے تقوٰی اور ایثار ہونا جس کی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں ہدایت و تعلیم ہے۔ چنانچہ جس مسلم معاشرے میں مذکورہ قسم کا ذہنی اور خارجی ماحول پوری طرح وجود میں نہ آیا ہو البتہ اس کے لئے سنجیدگی کے ساتھ کوشش جاری ہو تو اسلامی حکمتِ عملی کے تحت اس طرح کے معاشرے کے لئے عبوری طور پر اس کی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ معاش کے سلسلہ میں بادلِ نخواستہ اور بالآخر چھوڑنے کے ارادے سے ایسے امور و معاملات اختیار کر لے جو ان حالات میں قابلِ عمل ہوں اور جن کے اختیار کرنے سے موجودہ معاشی ظلم و فساد میں کچھ کمی ہو سکتی اور اجتماعی حالت نسبتاً بہتر بن سکتی ہو، چونکہ آج عام طور پر مسلمان معاشروں کی ایمانی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالت ہے وہ ویسی نہیں جیسی ہونی چاہئے لہٰذا کراہت کے ساتھ وہ بعض ایسے معاشی امور و معاملات اختیار کر سکتے ہیں جن کو اختیار کئے بغیر موجودہ حالات میں دوسرا کوئی چارۂ کار نہیں لیکن ان کے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ وہ اپنی مطلب برآری کے لئے شرعی الفاظ کے حقیقی مفاہیم و مطالب میں تحریف و ردّ و بدل کریں۔

تعارف وتبصرہ

شاہ اسمٰعیل شہید اور اُن کے ناقد

تصنیف : مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی مہتمم جامعہ رحیمیہ دہلی۔
قیمت : ۲۱/- اور ۱۵/- روپے۔
ملنے کا پتہ : سنی پبلیکیشنز الوہاب مارکیٹ اُردو بازار لاہور

شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید جتنے عظیم انسان تھے اتنے ہی مظلوم ہیں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بقول ان کی شہادت ۱۸۳۱ء سے لے کر اب تک کسی دن کا سورج طلوع نہیں ہوا جو اپنے دامن میں ان کے لیے نئی نئی گالیاں لے کر نہ آیا ہو اور یہ حرکات کون کرتے ہیں؟ وہ لوگ جن کے ایمان، عصمت اور جان کے تحفظ کے لیے شاہ صاحب نے اپنے شیخ و امیر حضرۃ سید احمد بریلوی اور اپنے ہزاروں مخلص رفقاء سمیت اپنی جانیں نچھاور و قربان کر دیں۔ ان کے خلاف بے ہنگم لٹریچر کا تازہ شاہکار دلی ہی کے ایک خانقاہ نشین مولانا ابوالحسن زید کا وہ رسالہ ہے جو انہوں نے مولانا شہید کے خلاف لکھا اور اسطرح کہ اس میں حقیقت و واقعیت کہیں بھی نہیں، البتہ مغالطہ دہی ضرور ہے، زید صاحب اپنی ایک کتاب میں کچھ عرصہ قبل سید صاحب اور شاہ صاحب کی تحریک کو سراہ چکے تھے لیکن اب انہوں نے یہ گولہ مارا جس کا جواب لکھا مولانا اخلاق حسین قاسمی نے جو مہتمم ہیں جامعہ رحیمیہ درگاہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے اور مصنف ہیں محاسن موضح قرآن سمیت متعدد علمی اور وقیع کتابوں کے۔ انہوں نے بڑی سادگی و پرکاری اور ذمہ داری سے یہ جواب لکھا ہے اور ان مغالطوں کو دور کیا ہے جو مخالفین پھیلاتے ہیں، کتاب کے پاکستانی ایڈیشن میں جسے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے ایک طویل مقدمہ شامل ہے جس میں اہل بدعت سمیت دوسرے مختلف موضوعات کی دسیسہ کاریوں کا علمی اور مسکت جواب ہے یہ کتاب ہمارے دینی، تاریخی اور علمی لٹریچر کا بہت اہم حصہ

ہے اور اس قابل ہے کہ اسے اہتمام سے پھیلایا جائے مجلد ایڈیشن کی قیمت ۲۱ روپے۔ اور کارڈ بورڈ ایڈیشن کی قیمت ۱۵ روپے نہایت مناسب اور موزوں ہے۔

پاکستان اسٹیٹ آئل ریویو کا خصوصی سیرت نمبر

پی ایس او کا ریویو گذشتہ چھ سال سے بڑے اہتمام کے ساتھ سیرت نمبر شائع کرتا ہے اور یہ اہتمام ہر سال ربیع الاوّل میں کیا جاتا ہے۔ بڑے سائز پر مشتمل یہ خصوصی مجلہ نہایت خوبصورت کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا گیا ہے جس میں عرب کے مفصل نقشہ کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ ضرورت کے مطابق چھوٹے نقشہ جات اور نبی کریم علیہ السلام کا شجرہ مبارک بھی شامل ہے۔ امسال نبی کریم علیہ السلام کی بعثت سے قبل کی زندگی مشہور خطیب اور اہل قلم شاہ مصباح الدین شکیل کے قلم سے شامل رسالہ ہے بلکہ یہ رسالہ ہی انہی کے رشحات فکر کا نتیجہ ہے۔ شاہ صاحب نے عرب کے جغرافیہ، وہاں کے قبائل، سیاسی و تمدنی نظم اور اجداد رسول پر ٹھوس معلومات جمع کرنے کے بعد سیرت رسول کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور بعض صدیوں پر پھیلی ہوئی غلطیوں سے علی الرغم صحیح واقعات و حقائق سپرد قلم کئے ہیں۔ سیرت کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے ہی نہیں ہر مسلمان کے لیے یہ رسالہ نہایت درجہ کارآمد اور مفید ہے۔ اشتیاق عسکر ایڈیٹر شعبہ امور عامہ پی ایس او داؤد سینٹر کراچی سے اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مکاتیب بہادر یار جنگ اور جامعہ عثمانیہ

یہ دو کتابیں بہادر یار جنگ اکادمی سراج الدولہ روڈ بہادر آباد کراچی کے اہتمام سے چھپی ہیں جن میں پہلی کتاب مشہور قومی رہنما اور مرحوم حیدرآباد کے ہر دلعزیز خطیب و قائد نواب بہادر یار جنگ کے مکاتیب (حصہ دوم) پر مشتمل ہے اس میں تین سو سولہ خطوط شامل ہیں جنہیں تاریخ وار مرتب ہی نہیں کیا گیا بلکہ فہرست مضامین میں سامنے کے کالم میں اس خط کا موضوع بھی متعین کر دیا گیا جس سے قاری کو استفادہ میں بے حد آسانی ہوتی ہے۔ یہ خطوط مملکت آصفیہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مختلف النوع معاملات و مسائل کو سمجھنے میں

بڑے ممد و معاون ہوں گے اور اس سے نواب صاحب کی سیرت و کردار کو سمجھنا بھی آسان ہو گا

دوسری کتاب مملکت آصفیہ حیدر آباد دکن کی عظیم یونیورسٹی "جامعہ عثمانیہ" کے تعارف پر مشتمل ہے جس میں پیش لفظ کے ساتھ ساتھ تین تحریریں شامل ہیں۔ دو تحریریں ڈاکٹر محمد ضیاء الدین صدیقی سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ کی ہیں ایک انگریزی میں بعنوان "جامعہ عثمانیہ آغاز و نشو و نما کا پہلا دور" یہ تحریر دراصل ۱۹۷۷ء کے جشن زمردیں (ڈائمنڈ جوبلی) کے موقعہ پر پڑھی گئی اس کا نہایت درجہ شگفتہ ترجمہ مجید امجد فاروقی صاحب نے کیا ہے۔ دوسری تحریر "جامعہ عثمانیہ، چند یادیں" کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کی اردو میں ہے یہ دونوں تحریریں اس عظیم علمی درس گاہ جس نے علم کے ساتھ ساتھ اردو کی بے پناہ خدمت کی، کے تعارف کے لیے بڑی اہم ہیں، اسی طرح تیسری تحریر "جامعہ عثمانیہ کا سنہری دور" جناب محمد ابراہیم صاحب کی ہے جو مملکت آصفیہ کے سابق ناظم تعمیرات تھے ——— اکادمی نے یہ کتاب شائع کر کے بڑا احسان کیا ہے کہ اس کے ذریعہ ہمیں ماضی کے دھندلکوں میں اپنی معارف پروری کا اندازہ ہو سکے گا اور کیا عجب کہ آج کے سفید ہاتھی اس آئینہ میں اپنی شکل بہتر بنانے پر آمادہ ہو جائیں۔ تیس تیس روپے میں یہ دونوں کتابیں دستیاب ہیں جن کی پذیرائی بے حد ضروری ہے۔

اہل سنت اور نظریہ امامت

۳۲ صفحات کا بقامت کہتر بقیمت .. بہتر رسالہ مولانا محمد اسحٰق صدیقی سندیلوی کے قلم سے ہے جو مہتمم اور استاذ رہے ندوۃ العلماء کے اور پھر مولانا بنوری کے مدرسہ نیو ٹاؤن کے، علم و تقویٰ اور خشیت الٰہی کا چلتا پھرتا نمونہ مولانا اسحٰق ہیں محتاط قلم، سنجیدہ تحریر، انداز بیان شگفتہ، دلائل میں وزن، اور عقل و نقل کا امتزاج۔ شیعہ حضرات کے تصور امامت، جو سراسر بے دینی اور الحاد پر مشتمل ہے، کے برعکس جماعت حقہ ناجیہ اہل سنت کا اس ضمن میں موقف ہی اس رسالہ میں ذکر و بیان کیا گیا ہے جو بڑے کام کی چیز ہے اور اس کا مطالعہ ہر سُنی پر لازم ہے تاکہ وہ اغیار کی دسیسہ کاریوں سے بچ سکے۔ اڑھائی روپے پر اسلامی کتب خانہ نزد مسجد بنوری ٹاؤن کراچی ۳۲ سے حاصل کریں۔

سں جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو

ن سکتا، مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ

ا بزرگ توئی قصّہ مختصر

جائے ں غور مسئلہ یہ ہے کہ:

کیا ہم ن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟

ا پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اھم موضوع پر

احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے

تعلّق کی بنیادیں

خود بھی مطالعہ کیجئے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے

ھدیہ فی نسخہ: تین روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے یک صد نسخوں پر ۳۳ فیصد کمیشن دیا جائے گا

Regd. L. No. 8193

HIKMAT-E-QURAN MONTHLY LAHORE

Vol. 4 | MARCH-APRIL 1985 | No. 1-2

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاھور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ـــــ اور ـــــ **سرچشمۂ یقین**

قرآن حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـ اور ـ **غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللہِ